123

# شعر العجم

(حصہ اول)

عشرت پبلشنگ ہاؤس
متصل لائن پریس عقب بان والی گلی
ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

**Rs. 3/-**

fzeu vrg begrzij

162/162
2925
3127
891.551
35555
1940
MC LIBRARY Nankana Sahib
0.1436NS
16-08-2022
Chughtai Public Library

# شعر العجم

## حصہ اوّل

عباس مروزی سے نظامی تک

| مادۂ تاریخ اختتام تصنیف | مادۂ تاریخ آغاز تصنیف |
|---|---|
| تذکرہ | تاریخ عجم |
| ۱۳۲۵ھ | ۱۳۲۴ھ |

مؤلفہ

مولانا شبلی نعمانی مرحوم

بفرمائش

عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ عقب پان والی گلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرم جویاں، درے رامے پرستند
فقیہاں، دفترے رامے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامے پرستند

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن

اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا۔ لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اُسی قدر زیادہ فیضیاب ہُوئی۔ عرب، ایران، ہند افغانستان، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم سب اس کے حلقہ میں آئے لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرق مراتب، اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے۔ اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، بو علی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری، سب ایران ہی کی خاک سے اُٹھے تھے، آج تمام اسلامی دُنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہے، ترکوں نے بڑی بڑی پُرزور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے۔

ایران کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص **شاعری** اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہُوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قایم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں، ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اُسنے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟ شعراء کے تذکرے بہت ہیں۔ لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ

اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں، شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد کے انقلابات اور اُن کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں، میں اسی کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا، مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور اُستاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے، میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی، لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا جس میں شعراء کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنّف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جس میں ژند، پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اسلام کی قبل کی تصنیفات کا سُراغ لگایا ہے، شاعری کی تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔

اس اثنا میں، مَیں سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد کے تعلق سے **سلسلۂ کلامیہ** کی طرف متوجہ ہوا، اور چند کتابیں لکھیں جو چھپ کر شائع ہوئیں، اس سلسلہ سے فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پُرانا خیال پھر تازہ ہوا۔ اور ۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا لیکن بیچ بیچ میں **موازنہ انیس** اور **الندوہ** سدراہ ہوتے رہے۔ جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور **فردوسی** کے حال تک پہنچا، تو ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ[1] بھی فردوسی کی کرامت تھی۔ کہ واقعہ سے ذرا پہلے **شاہنامہ** کا یہ مصرع **دریدو برید و شکست** و بہ بست، قلم کی زبان پر تھا، اس حادثہ نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا، پھر وہ سلسلہ شروع ہوا اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اوّل کا پہلا حصّہ انجام پذیر ہوا۔

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدماء، متوسطین، متاخرین کے تین دور ہیں، پہلا دور **حنظلہ** سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی سے ابو طالب کلیم تک، کلیم کے بعد شاعری، شاعری نہیں رہی بلکہ چیستان گوئی بن گئی اُن دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصّوں پر منقسم ہے، چوتھے حصّہ میں شاعری پر عام ریویو ہے، اور یہی حصّہ گویا کتاب کی جان، اور اُس کی روحِ رواں ہے، اس کتاب کی ترتیب میں جن

---

[1] شبلی نامہ سیہ را بہ جزائے عملش ؛ پا بریدند و صدا خاست کہ مرے بابیست

کتابوں سے مدد لی گئی ہے، اگرچہ بہت ہیں۔ لیکن خاص طرح پر جو ذکر کے قابل ہیں حسب ذیل ہیں

| نام کتاب | نام مصنّف | کیفیّت |
| --- | --- | --- |
| لب اللباب | عوفی یزدی | سب سے پہلا تذکرہ ہے، مصنّف ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں، پروفیسر براؤن نے تصحیح و تحشیہ کرکے شائع کیا ہے۔ |
| چہار مقالہ | نظامی عروضی سمرقندی | مصنّف نظامی گنجوی کا ہمعصر تھا۔ گو مختصر سا رسالہ ہے لیکن نہایت مفید باتیں لکھی ہیں، خود بھی باکمال شاعر تھا۔ |
| تذکرہ دولت شاہ سمرقندی | | مشہور تذکرہ ہے اور گو اکثر جگہ غلطیاں کی ہیں تاہم دلچسپ اور مفید ہے۔ |
| تاریخ آل غزنیں | بیہقی | مصنّف مسعود بن سلطان محمد غزنوی کے زمانہ میں تھا۔ ضمناً شعراء عصر کا تذکرہ کیا ہے۔ |
| عرفات | اوحدی | عرفی وغیرہ کا ہم صحبت تھا، یہ تذکرہ ضخیم دو جلدوں میں ہے، حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ |
| مے خانہ | عبد النبی فخر الزمانی | جہانگیر کے زمانہ میں تھا، صرف اُن شعراء کا حال لکھا ہے جنہوں نے ساقی نامے لکھے، تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصّل ہے اور اپنے ہمعصروں کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ |
| تذکرۃ الشعراء | میرزا طاہر نصیر آبادی | ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔ |
| مآثر رحیمی | عبد الباقی نہاوندی | مصنّف خانخانان عبد الرحیم کا درباری تھا کتاب اصل میں خانخانان کی سوانحعمری ہے، |

| نام کتاب | نام مصنّف | کیفیت |
| --- | --- | --- |
| | | ضمن میں تمام شعرائے خان خانانی کے حالات بھی لکھے ہیں اور تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصّل اور صحیح لکھے ہیں۔ |
| مراۃ الخیال | شیر خاں لودی | چھپ گیا ہے۔ |
| ہفت اقلیم | امین رازی | جہانگیر کے عہد میں لکھا گیا، مستند اور معتبر ہے |
| تذکرہ میر تقی کاشی | | ۹۹۳ھ کی تصنیف ہے۔ |
| تذکرۂ سامی | سام میرزا صفوی | خاندان صفویہ کا شہزادہ اور جہانگیر کا معاصر تھا۔ |
| حبیب السیر | | معتبر کتاب ہے، مصنّف جہانگیر کے عہد میں تھا. |
| ریاض الشعراء | والہ داغستانی | |
| سرو آزاد | مولوی غلام علی آزاد | شعرائے عہد تیموریہ کا تذکرہ ہے۔ |
| ید بیضاء | " | عام تذکرہ ہے۔ |
| خزانۂ عامرہ | " " | صرف اُن شعراء کا حال ہے جن کو مدح کے معاوضہ میں صلہ ملا۔ |
| مجمع النفائس | خان آرزو | |
| مجمع الفصحا | ہدایت قلی خاں | حال کی تصنیف ہے، شعرا کا کلام نہایت کثرت سے جمع کیا ہے۔ |

شعراء کے کلیات اور دیوان جس قدر نظر سے گزرے ان کی فہرست اس قدر لمبی ہے کہ کئی ورق صرف ہوں گے اس لئے قلم انداز کرتا ہوں۔

عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا: مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا، لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر دیا کہ زرتشت سے یکرنوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہو گئی۔

پروفیسر دار مسٹیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں کیومرث سے

لے کر اسلام کے عہد تک چار دور قائم کئے اور ہر دور کی زبان کی نحو و صرف، لغات، الفاظ و تغیرات پر مفصّل ریویو لکھا (یہ کتاب ہماری نظر سے گزری ہے) یورپ کے اور محقّقین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات لکھیں، خصوصاً اوؔستا اور ژندؔ کی زبان کے متعلق اس قدر کثرت سے معلومات مہیّا کئے کہ نکتہ نکتہ حل ہو گیا۔ اکثر اساتذہ کے دیوان، جو نایاب تھے، اُن کو بڑی کوشش اور تلاش سے بہم پہنچا کر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھاپا۔ منوچہری کے قصائد ایران میں نہایت ناتمام اور غلط سلط چھپے تھے۔ لیکن فرانس میں اس اہتمام سے چھاپا کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں، اس کے ساتھ فرینچ میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا، اور لغات و اصطلاحات کی علیحدہ فرہنگ لکھی۔ اسی طرح روؔس کے پروفیسر والن ٹن ژدکوسکی نے انوری کے قصائد چھاپے اور دیباچہ میں انوری کی سوانح اور کلام پر ریویو لکھا۔ پروفیسر نولدیکی نے خاص شاہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی، شعراء کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں سے سر گور اوسلی کا تذکرہ عام طور پر مشہور ہے۔ سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر براؤن نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں، اس کتاب[1] کے دو حصّے شائع ہو چکے ہیں

ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کی اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر شائع کیں۔ آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں۔ جن میں سے ایک کتاب یات زریران حضرت عیسیٰؑ سے پانچ سو قبل کی تاریخ ہے۔

ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گزریں، اور جن سے فائدہ اُٹھا سکنا ممکن تھا، میں نے فائدہ اُٹھایا، لیکن ان تمام باتوں پر بھی یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کتاب کے لکھنے کا جو حق تھا پُورا ہؤا۔ قدیم واقعہ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے جو کمی کی وہ آج کیونکر پوری ہو سکتی ہے ؎

گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد　　　پیداست کہ بایں سر و ساماں چہ نویسم

# شعر کی حقیقت

چونکہ ایک مدّت سے علم کی کمی اور طبیعتوں کی بد مذاقی نے شعر کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ پہلے شعر کی حقیقت سے بحث کی جائے تاکہ ایک صحیح معیار قائم ہو جس

---

[1] اس کتاب کا نام لٹریری ہسٹری آف پرشیا ہے اور لندن میں ۱۹۰۶ء میں چھاپی گئی ہے۔

سے ایران کی شاعری کا اندازہ کیا جائے[1]۔

شاعری کی حقیقت اور اس کی ماہیّت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی، چنانچہ اُس نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام بوطیقا (پوٹیری) ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشد نے اس کی تلخیص کی، اس تلخیص کے جستہ جستہ حصّے پروفیسر شیخو نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے شامل کئے ہیں، افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اسلئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے۔

کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے، اور وہی عام وخاص کی زبانوں پر جاری ہے یہ ہے کہ "کلام موزون ہو، اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو" لیکن یہ تعریف درحقیقت عامیانہ تعریف ہے، آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہے، لیکن قدماء کے کلام میں بھی اس کے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں کہ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں، کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابت کے صغیر السن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا، وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا وہ نام سے واقف نہ تھا، حسان نے کہا اچھا اس کی صورت کیا تھی؟ بچے نے کہا "کانہٗ مُلتف ببردی حِبَرَۃ"، گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے"، چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں، اس لئے اس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اُچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا۔ کہ "واللہ صار ابنی الشاعر" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا، فقرہ موزون نہ تھا، لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ تھی، حسان نے سمجھا کہ بچے میں شاعری کی قابلیت موجود ہے۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک شعر کی اصلی حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعرا اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیّل کا نام تھا، نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی کا معاصر تھا اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہے۔

شعر کی عام تعریف

شعر صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں

---

[1] شاعری کی حقیقت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے نہایت اجمالی لکھا ہے اس کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند والتیام قیاس نتیجہ بر آں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ کند، و بزرگ را خرد، نیکو را در لباس زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و با ایہام قوت غضبانی و شہوانی برانگیز و تا بداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب گردد۔"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوش نما ثابت کی جائے جس سے محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔

یورپ کے محققین کے نزدیک شعر کی ماہیت

یہ قدما کے اقوال و خیالات تھے یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مِل نے اس پر ایک نہایت مفصّل اور بسیط مضمون لکھا ہے۔ جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

"انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذبات انسانی کو کچھ تعلق نہیں، مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں تو اس سے ہم کو غصّہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال، دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے اور جو چیز ان جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے وہی شاعری ہے، اس تعریف کی بنا پر تصویر۔ تقریر۔ وعظ بھی شعر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی جذبات انسانی کو برانگیختہ کر سکتی ہیں۔ اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن مِل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ مثلاً اسپیچ لکچر وغیرہ کہ ان سب کا مقصد دوسروں کا متاثر کرنا ہوتا ہے، کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے، اُس کی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا۔ فرض کرو وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اُس کی زبان سے نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے

کلام کا نام ہے"۔ اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ "جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں، اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو اُس کا نام شاعری ہے"۔

مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اُردو کا دفترِ بے پایاں بالکل بیکار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا کہ مل صاحب کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علمائے ادب نے کیا ہے۔

شعر کی اصلی حقیقت

شعر (جیسا ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوّری یا نقالی ہے، فرق یہ ہے کہ مصوّر صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات" جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

ایک شخص کا عزیز دوست جُدا ہو رہا ہے، اس حالت میں جو اس پر صدمے گزرتے ہیں اور دل دوز خیالات کا جو طوفان اُس کے دل میں اُٹھتا ہے شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور ان کی تصویر کھینچی جاتی، تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی۔

اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس شئے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی طپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، غیظ، غضب، افسوس، حسرت، جوش، محبت، خوشی، ان اشیاء کا اس طرح بیان کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے یہی شاعری ہے۔

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

دُنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں، خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ، دریا وغیرہ خواہ غیر مادی مثلاً وصل، ہجر، تحسین، نفرین، ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے، اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے، لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں۔ بعض اشخاص پر کم بعض پر

زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہٖ اس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے۔

شاعر کے جذبات اور احساسات فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے، دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے، لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے، لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کر سکتے جس طرح شاعر کر سکتا ہے، حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کر سکتا ہو وہی شاعر ہے۔

برادرِ عزیز مولوی حمید الدین نے جمہرۃ البلاغت فن بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں ہے "شاعر کے لفظی معنے صاحبِ شعور کے ہیں۔ شعور اصل میں احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو، انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ مثلاً رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکات صادر ہوتی ہیں، رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے، انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں، اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے شاعر کی طبیعت پر رنج، یا خوشی، یا غصّہ، یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزون الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ، اسی طرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو الفاظ کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور جس طرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً ناچنے لگتا ہے، سانپ جھومتا اور لہراتا ہے، اسی طرح انسان کو چونکہ نطق کے ساتھ، نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوا

ہے اس لئے موزون الفاظ مُنہ سے نکلتے ہیں، اور ساتھ ہی انسان گنگنانے بھی لگتا ہے، اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہو جاتا ہے تو انسان ناچنے لگتا ہے، یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی شعر ہے، اس بیان سے ظاہر ہو گا کہ شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کی کمال شدّت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا، وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے۔ راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر پڑھتے تھے، شعر کے پڑھنے کو جو اہل عرب انشاد کہتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ انشاد کے اصلی معنے گانے کے ہیں۔

ارسطو نے اس بحث میں سخت غلطی کی ہے وہ کہتا ہے کہ شاعری کے جذبے کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نغمہ اور رقص، ایک قسم کی مصوّری ہے، یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، آواز اور حرکات کے ذریعہ سے اُن کی تصویر کھینچتا ہے، چنانچہ رقّاص جو کچھ گاتے ہیں، حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اسکو بتاتے جاتے ہیں۔

لیکن ارسطو کا یہ خیال غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی وغیرہ انسان کے دل میں نہایت پُر زور حرکت پیدا کر دیتے ہیں، یہی حرکت آواز، یا راگ یا رقص، یا تڑپ بن جاتی ہے۔ مثلاً انسان کو جب ہنسی آتی ہے تو دل میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے، اور یہی حرکت ہنسی بن جاتی ہے، اور چونکہ یہ آثار، حرکات نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں اسلئے وہ حرکات نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں، جس طرح الفاظ، معانی پر دلالت کرتے ہیں، غرض جس طرح نطق، ایک فطری چیز ہے، اسی طرح یہ اشارات و حرکات بھی خود بخود سرزد ہوتے ہیں۔ وہ نقالی اور محاکات کی غرض سے نہیں کئے جاتے، گو یہ ممکن ہے کہ محاکات کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے۔

ان تمام خیالات سے تم کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہُوا ہو گا، اور معلوم ہو گا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔

# فارسی شاعری کی ابتدا

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ اسلامی دَور میں، شاعری تیسری صدی سے شروع ہوتی ہے۔ ابوالعباس مروزی کے اشعار جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا اگر روایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریح خاطر تھی، جو سلسلۂ تاریخی کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی۔

شروع اسلام سے کئی سو برس تک فارسی شاعری کیوں وجود میں نہیں آئی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے، کہ دو سو برس تک شاعری کی زبان کیوں بند رہی، فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں "ظاہر است کہ اشعار قدیم، شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ، چنانکہ مشہور ست کہ تمام کتب و تواریخ عجمیاں را عرب سوختند؛ از کتب قدیمہ چیزے برجا نگذاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند، چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد، تا مدتے گذشت و اوضاع بنوع دیگر گشت"

یہ مجمع الفصحاء کی عبارت تھی جو زمانہ حال کا سب سے بڑا مستند تذکرہ ہے، اور ناصرالدین قاچار مغفور کے عہد میں ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوا ہے، یہ خیال اصل میں دولت شاہ کے تذکرے سے ماخوذ ہے، اُس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دی جائیں اس بنا پر، آل سامان کے زمانے تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا"

ان بزرگوں کی تاریخ دانی کی داد دینے کا یہ موقع نہیں، اس لئے ہمارے مضمون تراجم کو دیکھنا چاہیئے جو رسائل شبلی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن استدلال کس قدر لطیف ہے، یعنی چونکہ ایران کی قدیم کتابیں برباد کر دی گئیں، اس لئے اہلِ عجم فارسی میں شعر بھی نہ کہہ سکے!! اسلام نے ملکی زبان سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا، حضرت عمرؓ کے عہد سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے، حجاج کے زمانے سے عربی میں ہو گئے، لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی، رفتہ رفتہ فارسی عربی مخلوط ہو کر اُردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہو گئی، اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی، جب خود فارسی زبان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا، تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا، اُس کو مذہبی اثر سے اِس قدر

لبریز کر دیتا تھا کہ اُس کو سوائے مذہب کے دُنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا، خود عرب کو دیکھو، وُہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی، اسلام کے آتے ہی دفعتہً چاروں طرف سناٹا چھاگیا، ولید کے زمانہ سے جب شاہانہ در و دربار قائم ہوُا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی، اس لئے شاعری بھی عربی ہی رہی شعرا جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح اُن کی زبان کیونکر سمجھتا، اور نہ سمجھتا تو اُن کی داد کیا دے سکتا، اتنے سے سہارے سے کہ ماموں الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہوگیا تھا۔ عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا، اور ماموں الرشید نے اُس کے صلے میں ہزار دینار سالانہ مقرر کردیئے، ارباب تذکرہ لکھتے ہیں، کہ اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تہجی تھا، اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے، تو ابو حفص حکیم سعدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا، شعر یہ ہے ؎

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دودا　　　　دندارد یار، بے یار چگونہ بودا

ایک بڑا سبب یہ ہوُا کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون ادب و انشاء کا سرمایہ اس قدر وسیع کرلیا تھا، اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدّتیں پیدا کی تھیں کہ اس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں، یعنی ایران، مصر، شام، اندلس ان تمام ممالک اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کردیا، اسلئے عرب کی شاعری کے آگے دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری کرتے شرم آتی تھی، خراسان مصر و شام وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہوگئے تھے۔ لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی ہی میں کہتے تھے، چنانچہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عربی شعرا کا مفصّل تذکرہ لکھا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہوُا، اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہوکر نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت جو قائم ہوئی وہ خاندان طاہریہ تھا، جو ماموں الرشید کے مشہور سپہ سالار طاہر ذوالیمینین کی طرف منسوب ہے، یہ خاندان جو ۵۴ برس حکمران رہا اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا، اگرچہ خود مختاری کا مدعی نہ تھا، لیکن خراسان میں اس کا اس قدر زور اور اقتدار ہوگیا تھا کہ

خود مختاری کے تمام سر و سامان پائے جاتے تھے، دربار میں شعرا کا ہونا بھی ضرور تھا، اسلئے باوجود اس کے کہ یہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا، تاہم بہت سے شعرا پیدا ہو گئے منوچہری دامغانی نے ایک قصیدے میں متقدمین شعرا کا ذکر کیا ہے ؎

بوالعلا و بوالعباس و بوسلیک و بوالمثل　　آنکہ آمد از نوائح آں کہ آمد از ہری
از حکیمانِ خراسان کو شہید و رودکی　　بوشکورِ بلخی و بوالفتح بستی ہکذی

ان شعروں میں جن شعراء کے نام آئے ہیں، ان میں ظاہر یہ شعرا بھی ہیں، یعنی حنظلہ بادغیسی، محمود وراق، فیروز مشرقی،

حنظلہ بادغیسی، یہ سب سے پہلا شخص ہے، جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی ۲۱۹ھ میں انتقال کیا، عروضی سمرقندی کی تصریح[1] سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھا، چند اشعار یہ ہیں۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمے فگند　　از بہر چشم تا نرسد مر در اگزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمے بکار　　با روئے ہمچو آتش و با خال چوں سپند

یعنی میرا معشوق نظر بد سے بچنے کے لئے، آگ پر سپند جلاتا ہے، لیکن اس کو اسکی کیا حاجت ہے، اس کا چہرہ خود آگ، اور اس کا تل خود سپند ہے۔ حنظلہ نے ۲۱۹ھ میں وفات پائی۔

محمود وراق، محمد بن طاہر جو خاندان طاہر کا سب سے اخیر فرمانروا تھا یہ اُس کے زمانے میں تھا، مجمع الفصحا[2] میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں ؎

نگارینا بنقد جانت ندہم　　گرانی در بہا، از رانت ندہم
گرفتم بہ جاں، دامان وصلت　　نہم جاں از کف و دامانت ندہم

فیروز مشرقی، اصل میں یمن کا رہنے والا تھا، ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرغی است خدنگ او عجب دیدی　　مرغے کہ شکار او ہمسر جانا
دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ　　تا بچہ اش را برد بہ مہمانا

---

[1] چہار مقالہ صفحہ ۲۷

[2] یہ تمام حالات اور اشعار مجمع الفصحا سے ماخوذ ہیں۔

خاندان طاہریہ کے آخیر فرمانروا محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب صفار نے گرفتار کر لیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

خاندان صفاریہ کا عہد

یعقوب صفار، ذات کا ٹھٹیرا تھا، لیکن شاہانہ دل و دماغ رکھتا تھا، یہاں تک کہ خلافت عباسیہ کے زمانے میں اس نے علم بغاوت بلند کیا، اور خراسان و فارس پر قابض ہو گیا۔ ۲۹۰ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور اس کے بعد اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز حکمران رہ کر ۲۹۰ھ میں گرفتار ہوا اور اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا۔
اس چند روزہ خاندان نے بھی متعدد شعرا پیدا کئے جن میں سے ابو سلیک گرگانی زیادہ ممتاز ہے منوچہری دامغانی نے اس کو قدماء شعرا میں شمار کیا ہے۔ مجمع الفصحا میں اس کے یہ اشعار نقل کئے ہیں ؎

به مژده دل ز من بدزدیدی | اے بلب قاضی و بہ مژگان دزد
مژد خواہی کہ دل ز من بردی | اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد

شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی، یعقوب صفار کا ایک کم سن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا کر گرا، بچہ کی زبان سے بیساختہ یہ مصرع نکلا ع
غلطاں غلطاں ہمے رود تا لب گو، یعقوب بھی موجود تھا اس کو بچہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا، لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے، شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے اُنہوں نے کہا، ہزج ہے، پھر تین مصرع اور لگا کر رباعی کر دیا، اور دو بیتی نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے۔ لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں، جس سے اہل عرب کی دیانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

# خاندانِ سامانیہ

خاندان سامانیہ

اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ شاعری کی ابجد تھی لیکن خاندان سامانیہ نے دفعتہً اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا دست پرور تھا شاہنامہ جو عجم کا صحیفہ آسمانی ہے اُس کا عنصر اسی عہد میں تیار ہوا۔ اس خاندان کا

سلسلہ نسب بہرام چوبیں تک پہنچتا ہے اس لئے اس خاندان میں حکومت کا آنا جم وکسریٰ کا دوبارہ عالم وجود میں آنا تھا، عدل وانصاف، جاہ وجلال، شان وشوکت تربیتِ علم و فن، کسی بات میں وہ اپنے اسلاف سے کم نہ تھا۔

اس سلسلہ کے قائم ہونے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مامون الرشید کی جہاں اور شاہانہ فیاضیاں تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ قدیم خاندانوں کی تربیت کا خیال رکھتا تھا جس زمانے میں وہ مرو میں تھا، اس سلسلہ کا مورث اوّل اسد بن سامان دربار میں پہنچا اور مامون نے اس کو پایا قرب میں جگہ دی، جب مرو سے بغداد روانہ ہوا تو وہاں کے گورنر کو تاکید کرتا آیا کہ اسد کی اولاد کو معزز عہدے دیئے جائیں۔ اسد کے چار فرزند تھے، نوح، احمد، یحییٰ، الیاس، چنانچہ وہ سمرقند، فرغانہ، بشناس، ہرات کے گورنر مقرر کئے گئے، نوح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد سمرقند کا حاکم مقرر ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو اپنا قائم مقام کر کے خود گوشہ نشین ہوگیا، ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتضد باللہ نے نصر کو ماوراالنہر کی حکومت دی، اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو بخارا کا حاکم مقرر کیا۔ چند روز کے بعد دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو باہم لڑا دیا، یہاں تک کہ نصر میدانِ جنگ میں گرفتار ہو کر اسمٰعیل کے دربار میں آیا، لیکن اسمٰعیل نے حوصلۂ شاہانہ سے کام لیا اور بھائی کو آزاد کر کے تخت پر بٹھایا آپ دست بستہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر آدابِ دست بوسی کی رسمیں ادا کیں، اور عرض کیا کہ میں وہی آپ کا ماتحت صوبہ دار ہوں، نصر نے ۲۷۹ھ میں انتقال کیا، اور سمرقند کا صوبہ بھی اسمٰعیل کے ہاتھ آگیا۔

سلسلہ سامانیہ کی مستقل حکومت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا فرمانروا یہی اسمٰعیل تھا۔ یہ خاندان ایک سو تیس برس تک قائم رہا، اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ میں وفات پائی، اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور اس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ اور یہی وہ تاجدار ہے جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا، جو فارسی شاعری کا بانی اوّل کہا جاتا ہے، وہ نہایت فیاض عادل اور قدردانِ علم وفن تھا، تیس برس کی حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا نوح فرمانروا ہوا، وہ بھی باپ کی طرح مربی علم وفن تھا۔ فلسفہ وحکمت اور دیگر علوم وفنون کا جو کتب خانہ اس نے مرتب کیا تھا، اس کی نسبت علامہ ابن خلکان نے بوعلی سینا کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:۔

كانت[۱] عديم المثل فيها من كل فن من الكتب المشهورة بايدي الناس وغيرهم ما لا يوجد في سواها ولا سمع باسمه فضلاً عن معرفته

یہ کتب خانہ بےنظیر تھا، اس میں متداول اور مشہور کتابوں کے علاوہ وہ کتابیں تھیں جو اس کتاب خانہ کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں، اور جن کا جاننا تو درکنار کسی نے اِن کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔

فلسفہ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفائے عبّاسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں لیکن اکثر ترجمے نامفہوم اور مشتبہ تھے، اور جن کتابوں کے متعدد ترجمے ہوئے تھے وہ باہم مختلف تھے نوح بن نصر نے حکیم ابونصر فارابی کو بُلا کر فرمائش کی کہ ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کر دے، چنانچہ فارابی نے اس فرمائش کی تعمیل کی اور اس کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا، اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیئے کہ حکمائے اسلام میں فارابی نے معلم ثانی کا جو لقب حاصل کیا ہے وہ اسی کتاب کی بدولت تھا، افسوس ہے کہ یہ کتب خانہ جل گیا، اور چونکہ اس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا ضائع ہو گیا، اس لئے آج یہ بے نظیر کتاب ناپید[۲] ہے

نوح نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبدالملک اور عبدالملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا، اس کے دربار کا وزیر ابو علی بن محمد تھا، جس نے تاریخ طبری کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا، منصور نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی، اس کے بعد نوح بن منصور ثانی فرمانروا ہوا، دقیقی مشہور شاعر اسی کے دربار کا شاعر تھا، نوح کے بعد منصور بن نوح، اس کے بعد عبدالملک اور اس کے بعد اسمٰعیل بن

---

[۱] اس کتبخانہ کا حال خود بوعلی سینا کی زبانی طبقات الاطباء میں نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ بہت بڑا کتب خانہ تھا، ہر علم و فن کے لئے الگ الگ مکان تھے، اور اس میں صرف اسی فن کی کتابیں تھیں، کتابیں اُوپر تلے بہ ترتیب صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں، بوعلی سینا کا بیان ہے کہ مَیں نے قدما کی کتابوں کی فہرست دیکھی اور اپنی پسند کے موافق کتابیں نکلوا کر دیکھیں، اُن میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہ تھے اور خود مَیں نے بھی کبھی اُن کو نہیں دیکھا تھا۔ [۲] یہ واقعہ اکثر کتابوں میں ہے کشف الظنون (باب الحکمۃ) میں اس تمام واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے، اور مورخوں کو بھی یہ دھوکا ہوا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے، اس لئے فارابی نے ۳۳۹ھ میں انتقال کیا ہے اور منصور ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے ؛

عبدالملک تخت نشین ہوا اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا، جس کی تاریخ ۳۹۵ھ ہے۔

## شعرائے سامانیہ

سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گزرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے، طاہریہ عربی النسل خاندان تھا اس لئے فارسی شاعری کو اُس کے زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا، صفاریہ نو دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر نہ تھی، لیکن سامانی خاندان، نسل کیان کا یادگار تھا، ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی، قدردان علم و فن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحبِ کمال اور سخن سنج تھے وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اُن کی شاعرانہ قوتیں بالکل ایک غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں، خراسان و بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجم ہیں لیکن دارالخلافۃ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں، ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی، شعرا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے۔ کلیلہ دمنہ سنسکرت سے اولاً فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔ لیکن جب عبداللہ بن المقفع نے اس ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا تو فارسی نسخہ بالکل گمنام ہو گیا۔ نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے، عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی، اس لئے دقیقی کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد تھا، تفصیل ان واقعات کی آگے آتی ہے۔

شعرائے سامانیہ کی تعداد اگرچہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن عروضی سمرقندی وغیرہ نے جن لوگوں کا نام خصوصیت سے لیا ہے وہ یہ ہیں، ابوالعباس، ابوالمثل، ابو اسحاق جوئباری، ابوالحسن، جنازی نیشاپوری، ابوالحسن کسائی، شہید بلخی، ابوالموید، عبداللہ فرالاوی، رودکی، دقیقی، رابعہ فرداری، ابوذر، معمر جرجانی، ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری، عمارہ مروزی طخاری مرادی۔

یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس دور کا پہلا شاعر کون ہے؟ لیکن جہاں تک قرائن سے پتہ چلتا ہے ابو عبداللہ فرالادی، مرادی، شہید، ابوشکور بلخی، اس قافلہ کے پیشرو ہیں، رودکی کا ایک شعر ہے

شاعر شہید و شہرہ فرالادی | دیں دیگراں بہ جملہ ہمہ زادی
--- | ---

یعنی شاعر اصل میں شہید ہے لیکن فرآلادی مشہور زیادہ ہو گیا ہے، باقی اور شعرا انہیں دونوں کے رواۃ ہیں، رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

کاروانِ شہید رفت از پیش | واں مارفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم | وز شمار خرد ہزاراں بیش

# رابعہ

اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ فرداری بلخی، جو رودکی کی ہمعصر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی، اس کا باپ کعب، اعراب میں سے تھا، لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی، نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، بکتاش نام ایک غلام سے اس کو عشق تھا لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی نوبت پہنچی، چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ عورت کا کسی اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا، اس لئے لوگوں نے اس کو قتل کر ڈالا، مجمع الفصحا میں اس کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں ؎

دعوتِ من بر تو آں شد کایزدت عاشق کناد | بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ ہجر و غم کشی | چوں بہ ہجر اندر بپیچی پس بدانی قدرِ من

# رودکی

اِس دور کا مشہور شاعر ہے تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔

سامانیوں کے دور میں سینکڑوں شعرا تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئے گا۔ لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے، شریف گرگانی نے سچ کہا ؎

---

لہ مجمع الفصحا، تذکرۂ ابو عبداللہ فرالادی۔

ازاں چندیں نعیم جاہ و دانی | کہ ماند از آل ساسان و آل سامان
ثنائے رودکی ماندست و مدحش | نوائے باربد ماندست و دستان

رودکی کا اصل نام محمد یا جعفر ہے، رودک، نخشب، کے ضلع میں جس کو نسف بھی کہتے ہیں ایک گاؤں کا نام ہے، رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے، بعضوں کا بیان ہے کہ رودکی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ رود (ایک باجے کا نام ہے) اچھا بجاتا تھا۔

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادرزاد اندھا تھا، آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم قرأت کی تکمیل کی، اسی سن میں شعر کہنا شروع کردیا، شاعری کے مشغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے، خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی، سلاطین و امراء کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی، تقرب و اثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ وزراء سے بھی بالاتر ہوتا تھا اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیف الطبعی، حاضر جوابی، ظرافت، وسعت معلومات ضروری شرطیں تھیں، رودکی میں یہ سب شرطیں جمع تھیں، اس بناپر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں اس کو رسائی حاصل ہوئی، نصر نے اِس کی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی، تمام ارباب تذکرہ کا بیان ہے کہ رودکی کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امراء کو بھی نصیب نہ ہوئی، جب اس کی سواری نکلتی تو دوسو زرّین کمر غلام، رکاب کے ساتھ ساتھ چلتے، سفر میں اس کا اسباب چارسو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔[1]

یہ عموماً مسلّم ہے کہ فارسی شاعری عربی کے نمونے پر قائم ہوئی تھی. لیکن اس زمانہ میں عربی شاعری واقعیت اور حقیقت سے دُور ہوکر، ستائشگری اور مداحی کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہی تھی، متنبی، ابوتمام، بحتری، جو اِس دور کے پیغمبرانِ سخن ہیں، ان کا تمام تر کارنامہ یہی خوشامد اور ثناگستری تھا، خلفاء اور امراء شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے، لیکن خاندان سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لئے، چنانچہ رودکی کو کلیلہ دمنہ کے نظم کی خدمت دی اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کئے، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش | عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

---

[1] بہارستان جامی۔

رودکی کی شاعری کا عام انداز

رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسنِ تاثیر ہے۔ عرب جاہلیت کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے، فارسی شاعری تفریحِ طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی، یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا، لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنیٰ ہے۔

نصر بن سامانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا، اور بادغیس جو ہرات کا مشہور نزہت گاہ ہے، پڑاؤ ڈالا، بہار کے دن تھے، اور تمام دشت و صحرا چمن زار بن گیا تھا، نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گذر گئی، جاڑے آئے تو میووں کی بہتات ہوئی، ان اطراف میں ایک سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں، جن میں ترنیاں اور کلنجری نہایت خوش مزہ شاداب، اور نرم ہوتے ہیں، نصر صحرا سے اٹھ کر آبادی میں آیا اور دروازہ میں جو ایک مشہور مقام ہے قیام کیا، یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے، ہر طرف عالی شان قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائین باغ ہوتا تھا، اسی زمانے میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی؛ نصر نے جاڑے بھی یہیں گذارے، ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گذرنے پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن جب ایک موسم گذر جاتا تھا تو دوسرا زنجیر پا بن جاتا تھا، اسی طرح پورے چار برس گذر گئے، امراء اور فوج کے لوگ تنگ آ گئے تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا کو واپس جائے۔ اگلے دن رودکی دربار میں گیا۔ نصر شراب پی رہا تھا، رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی دھن میں یہ اشعار گائے۔

| | |
|---|---|
| بوئے جوئے مولیاں آید ہمے | یادِ یارِ مہرباں آید ہمے |
| ریگ آموی و درشتیہائے او | زیرِ پایم پرنیاں آید ہمے |
| آبِ جیحوں[۱] باہمہ پہناوری | خنگ مارا تامیاں آید ہمے |
| اے بخارا شاد باش و شاد زی | شاہ سویت میہماں آید ہمے |
| شاہ سرو است و بخارا بوستاں | سرو سوئے بوستاں آید ہمے |
| شاہ ماہ است و بخارا آسماں | ماہ سوئے آسماں آید ہمے |

نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اسی وقت سوار ہو کر بگٹٹ دوڑاتا

---

[۱] یعنی دریائے جیحوں۔

ہوا پوری ایک منزل پر جا کر دم لیا، سمرقندی نے یہ واقعہ لکھ کر حیرت ظاہر کی ہے۔ "کہ یہ ایک سیدھی سادھی نظم ہے، نہ کوئی صنعت ہے نہ مضمون بندی ہے اس کا اس قدر اثر کیونکر ہوسکتا تھا" دولت شاہ کے زمانے میں شاعری کی اصلی اور فطری حالت بدل چکی تھی، اس لئے لوگوں کو واقعیّت اور اظہار فطرت میں مزہ نہیں آتا تھا لیکن جب تک قوم میں صحیح مذاق باقی رہا شعراء ان اشعار پر سر دُھنتے تھے۔ عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر تھا چار مقالہ میں لکھتا ہے کہ

"ہنوز ایں قصیدہ راکسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضایق"

سلطان سنجر کے ملک الشعراء امیر معزی سے فرمائش کی گئی تھی کہ اس قصیدے کا جواب لکھے، چنانچہ اُس نے جو قصیدہ لکھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

رُستم از مازندراں آید ہمے　　　زیں ملک از اصفہاں آید ہمے

امیر معزی مشہور اور کامل الفن شعرا میں سے ہے لیکن رودکی کے کلام کے سامنے اسکے شعر کا جو رُتبہ ہے محتاج اظہار نہیں، رودکی نہایت پُرگو تھا، رشیدی سمرقندی[1] نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

شعراو را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار　　　ہم فزوں تر آید، ار چوناں کہ باید بشمری

مَیں نے اسکے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھہرے　　　اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں گے

اقسام سخن میں رودکی کے ہاں، قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ، سب کچھ موجود ہے مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلیلہ دمنہ جو اُس نے لکھی ہے، مثنوی ہی ہوگی، کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی طرح ادا نہیں ہوسکتے۔

مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے یعنی واقعہ نگاری

---

[1] جس زمانے میں مَیں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڑھ میں آئے، تو سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائیگا وہ تم لکھ دو، مَیں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے پھر یہ اشعار تھے

ہمچناں با شیم گرم گفتگو　　　قاصد از رہ ناگہاں آید ہمے

افگند شور مبارک باد و بس　　　ایں حدیثش بر زباں آید ہمے

آسماں جاہ از سوئے ملکِ دکن　　　جانب ہندوستاں آید ہمے

[2] مجمع الفصحاء ذکر رودکی۔

رودکی کی شاعری کی وسعت

خیال بندی، موعظت و نصیحت، عشق و محبت، مدح و ثنا، صنائع و بدائع سب چیزیں پائی جاتی ہیں، اور درجۂ کمال پر پائی جاتی ہیں، ہم مختصراً ہر ایک کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اخلاق و موعظت۔ اخلاق و موعظت میں حُسنِ ادا کے ساتھ، اس نے دقیق نکتے بھی بیان کئے ہیں، مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ تم کو اوروں کی خوشحالی پر رشک و حسد نہیں کرنا چاہیئے، اس کو وہ اس طرح دلنشین کرتا ہے ؎

زمانہ پندے آزادہ وار، داد مرا — زمانہ راچو نکو بنگری ہمہ پنداست
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار — بساکساں کہ بروز تو آرزو منداست

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہاری حالت پر رشک کرتے ہیں، اس لئے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں۔

اکثر آدمی لوگوں کی بخالت کی شکایت کرتے ہیں، لیکن اُن کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی شخص کی بخالت اور سخاوت پر توجہ کرنا گو طبعی اور طماعی کی دلیل ہے رودکی اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے

تا کہ گوئی کہ اہل گیتی — در ہستی و نیستی لئیمند
چوں تو طمع از جہاں بریدی — دانی کہ ہمہ جہاں کریمند

زمانہ کی بے ثباتی کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

زندگانی چہ کوتہ وچہ دراز — نہ بہ آخر بمرد باید باز
ہم بہ چنبر گزار خواہد بود — ایں رسن را اگرچہ ہست دراز
خواہی اندر عنا و محنت زی — خواہی اندر نشاط و نعمت وناز
خواہی اندک تراز جہاں بپذیر — خواہی از رَے بگیر تا بہ حجاز
ایں ہمہ بودہ باد تو خواب است — خواب را حکم نے مگر بہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی — نشناسی زیکدگر شاں باز

اپیکورس اور عمر خیام کے فلسفہ کو غالباً فارسی میں اوّل اسی نے روشناس کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

شاد زی، با سیاہ چشماں شاد — کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
زآمدہ شادمان نہ باید بود — وزگزشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد — شور بخت آں کہ او نخورد و نہ داد

باد و ابر است، ایں جہاں افسوس　　بادہ پیش آر ہرچہ بادا باد

خواجہ حافظؒ کا سارا دیوان اسی متن کی شرح ہے۔

روئے بہ محراب نہادن چہ سود　　دل بہ بخارا و بتان طراز
ایزد تا وسوسۂ عاشقے　　از تو پذیرد، نہ پذیرد نماز

واقعہ نگاری۔ یعنی کسی واقعہ یا حالت کی تصویر کھینچنا شاعری کا ایک عنصر ہے رودکی کے کلام میں یہ عنصر ہر جگہ نظر آتا ہے ایک قصیدہ میں اُس نے جوانی اور بڑھاپے کی کیفیت بیان کی ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرا بسود و فرو ریخت ہرچہ دنداں بود　　نہ بود دنداں، لابل، چراغ خنداں بود
یکے نماند کنوں، بل ہمہ بسود و بریخت　　چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیواں بود
نہ نحس کیواں بود، ونہ روزگار دراز　　چہ بود؟ راست بگویم، قضائے یزداں بود
ہمے ندانی اے ماہروئے غالیہ موے　　کہ حالِ بندہ ازیں پیش برچہ ساماں بود
بہ زلف چوگاں نازش، ہمے کنی تو بہ دِہ　　ندیدی او را آنگہ کہ زلف چوگاں بود
شد آں زمانہ کہ رویش بسان دیبا بود　　شد آں زمانہ کہ مویش بسان قطراں (سیاہ ۱۲) بود
شد آں زمانہ کہ او شاد بود و خرّم بود　　نشاط او بہ فزوں بود و غم بہ نقصاں بود
ہمیشہ دستش زی زنخگان خوشبو بود　　ہمیشہ گوشش زی مردمِ سخنداں بود
ہمیشہ شاد ندانستمے کہ غم چہ بود　　دلم نشاط طرب را فراخ میداں بود
عیال نہ، زن و فرزند نہ، مئونت نہ　　ازیں ہمہ تنم آسودہ بود و آساں بود
ہمے خرید و ہمے ریخت بے شمار درم　　بہ شہر ہرچہ ہمے ترکِ نار پستاں[1] بود
بسا کنیزک نیکو کہ میل داشت بدو　　بشب زیارت او نزد او بہ پنہاں بود
شد آں زمانہ کہ شعرو را جہاں بنوشت　　شد آں زمانہ کہ او شاعر خراساں بود
تو رودکی را اے ماہرو کنوں بینی　　بداں زمانہ ندیدی کہ در خراساں بود
بداں زمانہ ندیدی کہ در چمن رفتے　　سرود گویاں گوئی ہزار دستاں بود
کرا بزرگی و نعمت، ازیں و آں بودے　　ورا بزرگی و نعمت زآل ساماں بود
بداد میر خراسانش چل ہزار درم　　از و فزونی یک پنج، میر ماکان بود

---

[1] غنیمت ہے کہ ایرانی شاعر ہو کر مرد کے بجائے عورت کا نام لیتا ہے۔

کنوں زمانہ دگر گشت، دمن دگر گشتم — عصا بیار کہ وقتِ عصا و انبان بود

مدحیہ۔ مدحیہ شاعری کے جو نمونے پائے جاتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں، اور اُن میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی — زرّیں نہد بہ تیر در پیکان

تا کشتۂ او ازاں کفن سازد — تا خستۂ او، ازاں کند درمان

یعنی "بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے کہ لڑائی میں تیر جو استعمال کرتا ہے اُن کی پیکان سونے کی ہوتی ہے، جس سے یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکان کو بیچ کر اپنا علاج کرسکے، اور مرجائے تو تجہیز وتکفین کے کام آئے"۔

مرثیہ۔ مرثیے متعدد ہیں، اور سب میں مرثیہ کی خالص شان پائی جاتی ہے، ایک مرثیہ میں جو وزیر اعظم کے بیٹے کی وفات پر لکھا ہے، حکیمانہ انداز میں وزیر کو صبر کی تلقین کی ہے۔

اے آنکہ غمگینی و سزا داری — واندر نہاں سرشک ہمے باری

اے وہ کہ غمزدہ ہے، اور غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے — اے وہ کہ چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے

رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد — بود آنچہ بود، خیرہ چہ غم داری

جو گیا، گیا، جو آیا، آیا — جو ہونا تھا ہوُا، اب فضول کیوں غم کرتے ہو

ہموار کرد خواہی گیتی راہ؟ — گیتی است کے پذیرد ہمواری

کیا تم زمانہ کو ہموار کرنا چاہتے ہو — یہ زمانہ ہے، بھلا وہ کب ہموار ہوسکتا ہے

مستی مکن، نشنود او مستی — زاری مکن، کہ نشنود او زاری

جوش ظاہر نہ کرو، وہ جوش کا لحاظ نہیں کرتا — فریاد نہ کرو، وہ فریاد نہیں سنتا

شو تا قیامت زاری کن — کے رفتہ را بہ زاری باز آری

اچھا جاؤ قیامت تک روتے رہو — لیکن جو شخص چلا گیا، کیا وہ رونے سے واپس آجائیگا

شہید بلخی اور مُرادی، جو اس کے زمانہ کے مشہور شاعر تھے، اُن کا مرثیہ بھی لکھا ہے، جو مجمع الفصحاء وغیرہ میں منقول ہے۔

غزل۔ غزل نے اس وقت تک مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، قصائد کی ابتدا میں جو تشبیب کرتے تھے یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، اُس کا نمونہ یہ ہے۔

اے جانِ من از آرزوی تو پژمان — بنمائے یکے روئے بہ بخشائے برین جان

دشوار نمائی رُخ و دشوار دہی بوس | آسان بربائی دل و آسان ببری جان
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار | نزدیکِ تو دشواری من باشد آسان
مشوش است دلم از کرشمۂ سلمےٰ | چناں کہ خاطر مجنوں زطرۂ لیلےٰ
چو گل شکر دہیم، درد دل شود تسکین | چو ترش روئے شوی وارہانی از صفرا
ببردہ نرگس تو آب جادوئے بابل | کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسےٰ

والۂ داغستانی نے رودکی کی ایک غزل کی نقل کی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را | شکستہ سنبل زلفِ تو مشک سارا را

لیکن اس زمانہ کا یہ انداز نہیں ہے، اس کے علاوہ اس غزل کے مقطع میں تخلص بھی مذکور ہے حالانکہ اس زمانہ تک غزلوں میں تخلص نہیں لاتے تھے۔

رودکی کے ان اشعار کا جو رتبہ ہے ظاہر ہے تاہم عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود | غزل ہائے من رودکی وار نیست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عنصری، رودکی کو غزل گوئی میں اُستاد مانتا تھا، اس لئے یا تو ماننا چاہئے کہ رودکی کی عمدہ غزلیں جاتی رہیں، یا یہ کہ عنصری غزل گوئی میں رودکی سے بھی کم تھا۔

قصیدہ۔ قصیدہ کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا، آج تک قائم ہے، یعنی ابتدا میں تشبیب، یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود وسخا، عدل وانصاف، شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو ترصیع کہتے ہیں، یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں۔ مثلاً

عرفی رماد را اثر یہ قہر او کند شنجرف | جماد را اثر لطف کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے، اور چھٹی صدی تک تمام شعرا کا یہ عام انداز رہا۔

قصیدہ میں اگرچہ صرف مداحی ہی مداحی ہوتی ہے، لیکن رودکی نے جابجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں۔

از بنفشہ سبز پا گستردہ دیبا ہا بہ چین | وز شگوفہ شاخہا بربستہ دُر شاہوار بہار
باہوائے او سمت گفتی ہر چہ گفتی در نسیم | بزمینِ او ست گفتی ہر چہ در عالم بہار
از میان جوئے آں آبے رواں ہمچو گلاب | شاخہائے گل شگفتہ بر کنارہ جوئے بار
بود ہر جا بہر نزہت گاہ ہا، نقل و نقل | گلستاں در گلستاں و میوہ اندر میوہ زار

کوہ دیگر کوہ سیمیں گشت و زریں شد چمن (برف کی وجہ سے، زرد پتوں کی وجہ سے) | آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا (خزاں)
گشت خامش فاختہ، تا شد چمن پرداختہ (خالی) | گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا (آواز، بے سامان)
نار چوں بر حقۂ زریں نگیں ہائے عقیق | سیب چوں بر چہرۂ سیمیں نشانہائے بُکا
بادِ سرد آمد چو آہِ عاشقاں ہنگامِ صبح | بانگِ زاغ آمد چو از معشوق پیغامِ جفا

---

بدانگہے کہ دو لشکر بروئے یکدیگر | گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں
ز گردِ اسپاں تیرہ شود رخِ خورشید | ز بانگ مرداں خیرہ شود دل کیواں
یکے کشیدہ سناں و یکے کشادہ حسام | یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کمان

قصیدہ کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے، یعنی تشبیب، کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے، رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں مثلاً ایک قصیدہ میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہے ؎

بادخوار از مے کنارہ باغ پُر دینار کرد | چوں کنار زائراں را کرد دست بادشا

یا مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے ؎

یار من گفتا بہشت است اے شگفت (این باغ نیست) | گفتم ایں باغیست خرم چوں بہشت کردگار
آں بہشت ناپدید است، ایں بہشت استے عیاں | ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار
آں مکافات نماز است ایں مکافات مدیح | آں عطائے کردگار است، ایں عطائے شہریار

یعنی معشوق نے باغ کو دیکھ کر کہا کہ یہ بہشت ہے، میں نے کہا بہشت نہیں باغ ہے، لیکن خدا کی بہشت کے ہم پلّہ ہے، فرق یہ ہے کہ خدا کی بہشت کا پتہ نہیں، اور یہ علانیہ موجود ہے، یہ نقد ہے وہ اُدھار، یہ ظاہر ہے، وہ مخفی، وہ نماز پڑھنے سے ہاتھ آتی ہے اور یہ مدح کرنے سے، وہ خدا کا عطیہ ہے، اور یہ بادشاہ کا۔

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی، مثلاً ایک قصیدہ تینتیس ۳۳ شعروں کا کہا ہے جس میں صرف مطلع ہی ہیں، پہلا مطلع یہ ہے ؎

ندانی دردِ ہجر اے بت، مرا زاں زار گردانی | دگر زارم نگردانی بہ داغِ ہجر گردانی

**ہجو یا شکایت** | ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہایت بدنما داغ ہے، لیکن رودکی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے ؎

زہے سوار و جوان و توانگر از رہ دور | بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش

6/1436AS

پسند آید مر خواجہ را پس از دہ سال — کہ باز گردد پیر و پیادہ و دل ریش

ممدوح سے کہتا ہے کہ کیا یہ مناسب ہے کہ جو لوگ آپ کے دربار میں جوان، دولتمند اور سواریوں پر آئیں، وہ اس قدر آپ کے ہاں امیدواری میں پڑے جھولا کریں، کہ جب واپس جانے لگیں، تو دولتمند غریب، اور سوار پیادہ، اور جوان بوڑھا ہو کر جائے۔

جدّت مضامین | عام قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل نہیں ہوتی لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے مثلاً

گھوڑے کی تعریف
آفتابے کہ زجا بک قدی — بر سر ذرہ نماید جولان

شراب کی تعریف
رودکی چنگ برگرفت و نواخت — بادہ انداز، کو سرود انداخت

آں عقیقین مے کہ ہر کہ بدید — از عقیق گداختہ نشناخت

تشبیہ
ہر دو یک گوہرند، لیک بطبع — ایں بیفسرد، آں دگر بگداخت

یعنی شراب، اور عقیق، دونوں ایک ہی چیز ہیں، فرق یہ ہے کہ ایک سیّال عقیق ہے، اور دوسری منجمد، شراب کے رنگ، اور نشہ کی یہ کیفیت ہے کہ بے چھوئے ہوئے ہات رنگین ہو جاتے ہیں، اور بے چکھے ہوئے دماغ میں دوڑ جاتی ہے۔

بنفشہائے طرب خیل خیل سر بر کرد — چو آتشے کہ بگوگرد بر دوید کبود

بیار دہان بدہ آں آفتاب کش بخوری — ز لب فرو شود و از دہان بر آرد دود

یعنی بنفشہ دستہ دستہ اُگ رہا ہے، جس طرح گندھک سے جلانے کے وقت، رنگ کا شعلہ اُٹھتا ہے، اب وہ آفتاب لاؤ (یعنی شراب)، کہ ادھر ہونٹوں سے اُترے اور اُدھر منہ سے دھواں اُٹھنے لگے۔

تیر او مانندۂ روزی کہ زے مردم رسد — تیر دشمن باز گردد سوئے دشمن چوں صدا

یعنی ممدوح کا تیر، اس طرح نشانے پر لگتا ہے جس طرح انسان کا مُقدّر، اور دشمن کا تیر اس طرح دشمن ہی کی طرف پلٹ جاتا ہے جس طرح آواز۔

ہر آنچہ بست میان ارم بہم شدّاد — ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قاروں

سرشک ابر پراگندہ کرد در بستاں — نسیم باد پدیدار کرد در ہاموں

یعنی باغِ ارم میں شدّاد نے جو چیزیں فراہم کی تھیں، بادل کے آنسوؤں نے وہ سب باغ میں پھیلا دیں، اور قارون نے زمین کے اندر جو چیزیں چھپا رکھی تھیں، نسیم نے وہ سب میدان میں کھول کر دکھا دیں۔

مہ نیساں شبیخوں کرد، اکنوں بر مہ کانوں
کہ گردوں گشت از وُپُر گرد، وصحرا گشت ازو پُرخوں

اگر خواہی نشانِ خوں، نگہ کن لالہ بر صحرا
اگر خواہی نشانِ گرد بنگر ابر بر گردوں

یعنی بہار کے مہینے نے خزاں کے مہینے پر شبخوں مارا جس کی وجہ سے صحرا پُرخون ہوگیا، اور آسمان میں گرد بھر گئی، صحرا میں جو لالہ نظر آتا ہے، یہ وہی خون ہے۔

نگارینا شنیدستم کہ گاہِ محنت و راحت
سہ پیراہن سلب بودہ است یوسفؑ را بہ عمر اندر

یکے از کید شد پُرخوں، دوم شد چاک از تہمت
سوم یعقوبؑ را از بوئے روشن کرد چشم تر

رخم ماند بداں اوّل، دلم ماند بداں دوم
نصیبِ من شود در وصل آں پیراہن دیگر

یعنی اے معشوق! مَیں نے سُنا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے تین پیراہن تھے، ایک خون سے رنگین ہوا، دوسرا زلیخا نے چاک کیا، تیسرے نے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن کیں، میرا چہرہ پہلے پیراہن کے مشابہ ہے، اور میرا دل دوسرا پیراہن ہے، باقی تیسرا، وہ خدا وصل میں نصیب کرے۔

زلف ترا جیم کہ کرد، آں کہ او
خال ترا نقطۂ آں جیم کرد

از دہن تنگ تو گویا کسے
دانگکے نار بدونیم کرد

یعنی تیرا دہن ایسا چھوٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے انار کے دانہ کے دو حصّے کر دیئے ہیں۔

**رباعیاں** رباعیاں معمولی ہیں مجمع الفصحا میں ایک، رباعی نقل کی ہے۔

چوں کار دلم ز زلف او ماند گرہ
در ہر رگِ جاں صد آرزو ماند گرہ

امید ز گریہ بود، افسوس افسوس
کانہم شب وصل در گلو ماندہ گرہ

لیکن یہ ہرگز رودکی کے زمانہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

**قبولیت عام اور اعتراف شعرا** رودکی کے کمال شاعری کو تمام شعرا نے تسلیم کیا ہے، خود اس کا معاصر اور ہم فن اور ہمپایہ شہید کہتا ہے۔

بسخن ماند شعر شعراء
رودکی را سخنش تلو نیا است

شاعراں را خہ واحسنت، مدیح
رودکی را خہ واحسنت ہجاست

عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار، نیکو بود
غزل ہائے من رودکی وار نیست

اگرچہ بکوشم بہ باریک وہم
دریں پردہ اندر مرا بار نیست

معروف بلخی کہتا ہے۔

از رودکی شنیدم سلطان شاعراں

دقیقی کہتا ہے۔

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح / امامِ فنون و سخنور بود

دقیقی مدیح آورد نزد اُو / چو خرما بسوئے ہجیور بود

نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے رودکی کی شاعری پر اعتراض کیا تھا نظامی نے اُس کے جواب میں لکھا ہے۔

اے آنکہ شعر کردی در شعر رودکی / ایں طعن کردنِ تو از جہل و کودکی است

کانکس کہ شعر داند داند کہ در جہاں / صاحب قرآن شاعری، اُستاد رودکی است

رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی - اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے۔

# دقیقی

سلسلۂ سامانیہ کے ہر فرمانروا کا عہد، اگرچہ بام ترقی کا ایک نیا پایہ ہے. لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخرالمنازل ہے، یہ فخر اسی دور کو حاصل ہے، کہ عجم کا سرمایۂ فخر و ناز یعنی "شاہنامہ" جس کو ابن الاثیر، قرآن العجم کہتا ہے، اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں قائم ہوا، اور اگر ایک اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا، تو سلطان محمود کے کارناموں کی فہرست شاہنامہ کے نام سے خالی رہ جاتی۔

سامانی خاندان، ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے، لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ، شعر کے قالب میں آجائے، نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے، ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا، اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے، ابتدائی تربیت امراء چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی، لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا، تو نوح نے دربار میں بُلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا، اُس نے یہ خدمت قبول کی، اور کم و بیش بیس ہزار شعر لکھے، بعضوں کا بیان ہے، کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ

---

[1] تذکرہ ہفت اقلیم و مجمع الفصحاء روایت اخیر۔

میں شامل ہیں، فردوسی نے شاہنامہ کی تاریخ کے بیان میں ان واقعات کو اس طرح اجمالاً لکھا ہے ؎

جوانے بیامد کشادہ زباں — سخن گوئی وخوش طبع و روشن رواں
بہ شعر آرم این نامہ را گفت من — از و شادماں شد دل انجمن
ز گشتاسپ وارجاسپ بیتے ہزار — بگفت و سرآمد ورا روزگار

کیا عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کا دامنِ عزت ایک اخلاقی دھبے سے داغدار ہے، دقیقی کا ایک خوشرو غلام تھا، جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی، لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا، غلام نہایت غیوّر تھا، اُس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا، فردوسی نے اس ناگوار واقعہ کو ابہام کے پردہ میں ادا کیا ہے۔

جوانیش را خوئے بد یار بود — ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
یکایک از و بخت برگشتہ شد — بدستِ یکے بندۂ کشتہ شد

فردوسی نے فیّاض دلی سے اس کے اشعار شاہنامہ میں شامل کر لئے، جس کی بدولت آج اس کا نام زندہ رہ گیا، چنانچہ خود کہتا ہے ؎

کنوں راز ہا باز جویم ترا — حدیث دقیقی بگویم ترا
چناں دید گوینده یک شب بخواب — کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب
دقیقی ز جائے پدید آمدے — بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز دادے کہ مے — مخور جز بہ آئین کاؤس کے
کہ شاہے گزیدے ز گیتی کہ تخت — بنازد بدو تاج و شمشیر و بخت
شہنشاہ محمود گیرندہ شہر — ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
بدیں نامہ گر چند بشتافتے — کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتے
از اندازہ من بیش گفتم سخن — اگر باز یابی بخیلی مکن
ز گشتاسپ وارجاسپ بیتے ہزار — بگفتم سرآمد مرا روزگار
گر آں مایہ نزد شہنشہ رسد — روانِ من از خاک بر مہ رسد
بداند کہ پیش از تو آخر کسے — دریں داستاں رنج بردش بسے
پذیرفتم و داشتم زو سپاس — مرا درد دل آمد زہر سو ہراس

که روزے مرا ہم بیاید گذشت | ز گفتار او در نشاید گذشت
ز گفتار او بشنو، اکنوں سخن | که گفت است ایں داستانِ کہن

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جام شراب ہے، دقیقی کہیں سے آنکلا اور اُس نے کہا کہ شراب، کیانی طریقہ سے پیو، تم کو ایسا بادشاہ ہاتھ آگیا ہے جس پر سلطنت کو ناز ہے، تم نے شاہنامہ کے لئے بہت تگ و دو کی، جو تم چاہتے تھے وہ تم کو مل گیا، مَیں نے بھی گشتاسپ دارجاسپ کے واقعہ میں ہزار شعر لکھے تھے تم کو اگر یہ اشعار ملجائیں تو اپنی کتاب میں شامل کر دینا کہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اور بھی کسی نے کچھ محنت اُٹھائی تھی۔

یہ سُن کر میرا دل کانپ اُٹھا کہ مجھ کو بھی ایک دن مرنا ہے، اس لئے اس کی خواہش پُوری کرنی چاہئے، اب تم اس کے اشعار سُنو۔

فردوسی نے دقیقی کے ساتھ جس ہمدردی اور مُردہ پرستی کا اظہار کیا ہے، قدر کے قابل ہے، لیکن داستان کے ختم ہوتے ہوتے نیت بدل جاتی ہے، دقیقی کے اشعار کے بعد کہتا ہے۔

نگه کردم ایں نظم سست آمدم | ہمہ بیتہا نادرست آمدم
من ایں زاں نوشتم که تا شہریار | بداند سخن گفتنِ نابکار
دہاں گر بماند ز خوردن تہی | ازاں بہ که ناساز خوانے نہی
دو گوہر نمودم بہ گوہر فروش | کنوں شاہ دارد بہ گفتار گوش
سخن چوں بدیں گونہ بایدت گفت | مگو و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نباشد چو آبِ رواں | مبر دست، زی نامۂ خسرواں

یعنی جب مَیں نے دقیقی کی یہ نظم دیکھی تو تمام اشعار مجھ کو سست اور غلط نظر آئے مَیں نے یہ اشعار اس لئے نقل کر دیئے کہ بادشاہ ان اشعار کی لغویت سے واقف ہو جائے اگر آدمی کو کھانا نہ دیا جائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے بد مزہ کھانے لائے جائیں، میں نے گوہر فروش کے سامنے دو موتی رکھ دیئے ہیں، اب بادشاہ خود تمیز کرلے، جب تم کو اس طرح کا شعر کہنا آتا ہے تو اس سے تو نہ کہنا ہی اچھا ہے، جب تمہاری طبیعت میں روانی نہیں ہے، تو سلاطین کی تاریخ پر کیوں ہاتھ ڈالتے ہو۔

اگر دقیقی کا کلام نقل کرنے سے اپنے اشعار کا چمکانا مقصود تھا تو اُس غریب پر احسان

رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اس لئے اندازہ کرنا چاہئے کہ سلطان محمود کی ہجو میں کس حد تک واقعیت کا پہلو ہوگا۔

فردوسی خدائے سخن ہے، اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرأت ہو سکتی ہے؟ لیکن ع انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت است۔ ہم سرسری طور پر یہاں دقیقی کے چند

**دقیقی کا اندازِ کلام**

اشعار بغیر کسی انتخاب کے نقل کرتے ہیں، جس سے دقیقی کے رتبۂ کلام کا اندازہ ہو سکے گا، وہ معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچتا ہے ؎

ز بس بانگ اسپاں و جوش و خروش    ہمے نالۂ کوس نشنیدہ گوش
درفشاں (علم ۱۲) بسیار افراشتہ    سر نیزہا، ز ابر بگزاشتہ
چو رستہ درخت از بر کوہسار    چو بیشہ نیستاں بوقتِ بہار
ز تاریکیِ گرد و بانگِ سپاہ    کسے روز روشن، نہ دید راہ
بکردند یک تیر باراں نخست    بساں تگرگِ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب    ز پیکانہائے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمے    وزاں ابر الماس بارد ہمے
ہوا زیں جہاں بود شبگوں شدہ    زمیں سر بسر پاک در خوں شدہ
در و دشتہا شد ہمہ لالہ گون    بہ دشت و بیاباں ہمے ریخت خوں
چناں شد ز بس کشتہ آں رزمگاہ    کہ برد ے نہ تانست (توانست ۱۲) رفتن نگاہ

فردوسی کے کلام کا جو اصلی جوہر ہے یہی ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے، اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے، انصاف سے کہو، کیا ان اشعار میں یہ بات نہیں ہے؟ بے شبہ فردوسی نے اس وصف کو کمال تک پہنچا دیا، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھنچ کر تیز ہو گئی ہے
دقیقی کے زمانہ تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی، عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں، لیکن عربی الفاظ، فارسی سے زیادہ ہیں رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام اسی کے قریب قریب ہے، سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے، وہ دقیقی ہی ہے، اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج، شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا، دقیقی نے زبان کو جس طرح صاف کیا، اس کا

نمونہ یہ ہے ؎

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت — فرود آمد از تخت و بربست رخت

بہ بلخ گزیں شد بداں نوبہار — کہ یزداں پرستانِ آں روزگار ق

مر آں خانہ را داشتندے چناں — کہ مر مکہ را تازیاں (اہل عرب ۱۲) ایں زماں

بداں خانہ شد شاہ یزداں پرست — فرود آمد آں جا و ہیکل بہ بست

بہ بست آں درِ آفریں خانہ را — دراں خانہ نگزاشت بیگانہ را

بپوشید جامہ پرستش (عبادت گاہ ۱۲)، پلاس (گزی) — خدا را چنیں داشت باید سپاس

بیفگند یارہ (کنگن)، فروہشت (فکِ اضافت) موے — سوئے روشن دادگر کرد روے

نیایش ہمے کرد خورشید را — چناں بردہ بُد راہ جمشید را

چو گشتاسپ بر شد بہ تخت پدر — کہ فرّ پدر داشت بخت پدر

بسر بر نہاد آں پدر دادہ تاج — کہ زیبندہ باشد بر آزادہ تاج

منم گفت یزداں پرستندہ شاہ — مرا ایزد پاک داد ایں کلاہ

بداں داد ما را کلاہِ بزرگ — کہ بیروں کنیم از رمہ میش گرگ

سوئے راہ دزداں نیاریم چنگ — بر آزادہ گیتی نداریم تنگ

پس از دفتر نامور قیصرا — کہ ناہید بُد نام آں دخترا

کتایونش خواندی گرانمایہ شاہ — دو فرزندش آمد چو خورشید و ماہ

یکے نامور فرخ اسفندیار — شہے کارزاری، نبردہ (سپاہی) سوار

پشوتن دگر گرد شمشیر زن — شہے نامبردار لشکر شکن

چو یک چند گاہے بر آمد بریں — درختے پدید آمد اندر زمیں

از ایوان گشتاسپ بسیان کاخ — درختے گشن برگ و بسیار شاخ

ہمہ برگ او پند، بارش خرد — کسے کو چنو بر خورد کے مرد

خجستہ پے نام او زردہشت — کہ اہرمن بدکنش را بکشت

ان اشعار میں جا بجا فکِ اضافت اور الف اشباع ہے جو آج کل متروک و معیوب ہے، لیکن قدما کے ہاں اس کا عام رواج تھا، فردوسی بے تکلف ان چیزوں کو برتتا ہے۔

دقیقی نے مثنوی کے ساتھ، قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی، یہ دو شعر ہونا معلوم طور پر

لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں، اسی کی غزل کے ہیں ؎

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد — آرے دہد ولیک بہ عمرِ دگر دہد
من عمرِ خویشتن بہ صبوری گذاشتم — عمرِ دگر بباید تا صبر بر دہد

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں، اور یہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہے

اس کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رزم و بزم اور عشق و عاشقی کے دائرہ میں محدود نہیں، آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں، فارسی میں غالباً سب سے پہلے اُسی نے اس کی بنیاد قائم کی، ایک قصیدہ میں بہار کا سماں دکھایا ہے۔ اس میں خوشرنگ اور رنگ برنگ پھولوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے ؎

نیچرل شاعری

سحرگاہاں کہ بادِ نرم جنبد — بجنباند درختِ سُرخ و اصفر (زرد)
تو پنداری کہ از گردوں ستارہ — ہمے بارید بر دیبائے اخضر (کمخواب)
نگار اندر نگار و لون در لون — ہزاراں در شدہ پیکر بہ پیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے،

غزل مسلسل

در افگند اے صنم ابرِ بہشتی — زمیں را خلعتِ اُردے بہشتی
زمیں برساں خون آلودہ دیبا — ہوا برساں مشک اندودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک — مثال دوست بر صحرا نوشتی
بتے رخسارِ او ہم رنگِ یاقوت — مے بر گونۂ جامہ کنشتی (نصیبر)
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی — بجائے نرمی و جائے درشتی
ز گل بوئے گلاب آید بہ انسان — کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیداست — بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لبِ یاقوت رنگ و نالۂ چنگ — مے خوں رنگ و کیشِ زردہشتی[1]

## شہید بلخی

زمانہ کی ناقدردانی کی شکایت

اس دور کا مشہور شاعر ہے، مختصر تذکرہ اس کا اُوپر گذر چکا، اشعار کا نمونہ یہ ہے ؎

دانش و خواستہ است نرگس و گل — کہ بہ یکجائے نشگفتند بہم

---

[1] زردہشتی، کیونکہ زردشت کے مذہب میں شراب حلال ہے؎

ہر کرا دانش است خواستہ نیست — ہر کرا خواستہ است دانش کم

اگر غم را چو آتش دود بودے — جہاں تاریک بودے جاودانہ

دریں گیتی سراسر گر بگردی — خردمندے نیابی شادمانہ

بر فلک ہر دو شخص پیشہ ورند — ایں یکے درزی، ان دیگر جولاہ

ایں نہ دوزد مگر کلاہِ ملوک — واں نہ بافد مگر پلاسِ سیاہ

تشبیہات

ابر ہمے گرید چوں عاشقاں — باغ ہمے خندد معشوق وار

رعد ہمے نالد مانندِ من — چوں کہ بنالم بہ سحرگاہ زار

چوں چلیپائے روم زاں شد باغ — کاب ریزے است باغ از جلی

ابر چوں چشم ہند بن عتبہ است — برق مانندِ ذوالفقارِ علی

موعظت ونصیحت

عیب باشد بہ کارِ نیک درنگ — گر شتاب آید اے رفیق ملام

عاقبت را ہم از نخستیں بیں — تا بہ غفلت گلو نہ گیر دوام

# ابو شکور بلخی

۳۳۶ھ میں تھا، اس کا کلام بہت کم ملتا ہے، جس قدر موجود ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اس قدر تحقیقات وتدقیقات کے بعد کیا معلوم ہوُا؟ اُس نے کہا "یہ معلوم ہوُا کہ کچھ نہیں معلوم ہوُا" اس فلسفیانہ خیال کو کس قدر عمدہ اور شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

تا بہ آنجا رسیدہ دانشِ من — کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اس حد تک ترقی کر گیا کہ میں نے اب جان لیا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کی مثنوی کے چند اشعار جو منقول ہیں اُن میں صاف شاہنامہ کا رنگ نظر آتا ہے ؎

بہ دشمن برت مہربانی مباد — کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد

درختے کہ تلخش بود گوہرا — اگر چرب وشیریں دہد مردرا

ہماں میوۂ تلخت آرد پدید — ازو چرب وشیریں نخواہی مزید

اسی مضمون کو فردوسی نے زیادہ بلند کر دیا ہے۔

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت — گرش برنشانی بہ باغ بہشت

دراز جوئے خلدش بہنگام آب  |  بہ بیخ انگبیں ریزی وشہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد  |  ہماں میوۂ تلخ بار آورد

## خبازی نیشاپوری

دولت سامانیہ کا نامور شاعر ہے ۳۴۲ھ میں وفات پائی، اس کا کلام بالکل نایاب ہے، ایک قصیدہ کی گریز کے دو شعر مشہور ہیں جن میں متاخرین کی جدّت مضمون کے ساتھ، نیچرل رنگ بھی موجود ہے ؎

مے بینی آں دو زلف کہ بادش ہے برد  |  گوئی کہ عاشقے است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجب سالار لشکر است  |  کز دور مے نماید کامروز بار نیست

یعنی معشوق کی زلف جو ہوا سے ہل رہی ہے، گویا ایک بے چین عاشق ہے یا شاہی نقیب کا ہاتھ ہے جو دور سے اشارہ کر رہا ہے، کہ آج دربار نہ ہوگا۔

## عمارہ مروزی

مرو کا رہنے والا تھا، ۳۶۵ھ میں انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

آتش اگر ندیدی با آب ممتزج  |  اینک نگاہ کن تو بدیں جام وایں شراب
جام بلور و بعل مئے صاف اندرو  |  گوئیکہ آتشے ست برآمیختہ بہ آب

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوشگوار اور خوش فکر تھے۔ مثلاً اعجمی طخاری، ابوالعباس زنجی، ابوالمثل بخاری، طلحہ وغیرہ لیکن چونکہ اُن کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لئے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں۔

## غزنویہ

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی، لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی، فردوسی، اسدی، طوسی، عنصری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری، دامغانی، جن میں ہر شخص اقلیم سخن کا صاحب تاج وتخت ہے، اسی عہد کی یادگار ہیں۔
سلسلہ غزنویہ، حقیقت میں سامانی حکومت کی ایک شاخ ہے، عبدالملک بن نوح

سامانی المتوفی ۳۵۰ھ کے زمانہ میں الپتگین جو اسی خاندان کا غلام تھا، ترقی کرکے امارت کے درجہ تک پہنچ گیا، عبدالملک نے اس کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا، عبدالملک کے بعد جب اُس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین، خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس حکومت کرکے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق قائم مقام ہوا، لیکن چند روز کے بعد مر گیا، الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا، اُس نے الپتگین، کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اُسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا، یہی غلام (در غلام) سلطنتِ غزنویہ کا بانی اول ہے اور سلطان محمود فاتح ہندوستان اُسی نامور کا فرزند ہے، سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا، اور جیپال کو بار بار سخت شکستیں دیں، سامانی دربار سے اس کو ناصر الدین کا خطاب ملا۔ ۳۸۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا، بلخ میں تخت نشین ہوا، محمود غزنین میں تھا، اُس نے بھائی کو لکھا، کہ آپ بلخ میں حکومت کیجئے، لیکن غزنین میرے قبضہ میں رہنے دیجئے اُس نے نہ مانا، اس پر جنگ ہوئی اور اسمٰعیل نے شکست کھائی، محمود باپ کی زندگی ہی میں نوح سامانی کے دربار سے یمین الدولہ کا لقب ملا۔

غزنوی خاندان کا اجمالی تذکرہ

محمود کی شاہانہ فتوحات اور معرکہ آرائیاں ایک دلچسپ داستان ہے، جس کی آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آرہی ہے، لیکن شعر العجم کی زبان سے اس کے ملکی فتوحات کے بجائے، علمی فتوحات کا ترانہ زیادہ موزوں ہوگا۔

سلطان محمود کے علمی کارنامے

محمود جس طرح فاتح و کشور ستان تھا، اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، جواہر مضیئہ جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے، اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے، فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے، غزنین میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود[1] تھے ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے، اکثروں کو بلا کر دربار میں جگہ دی تھی، ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی بھی تھا جو متعدد فنون میں بو علی سینا کا ہمپایہ و ہمسر تھا بوعلی کو بھی اس نے خوان کرم پر دعوت دی تھی، لیکن اس کو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا۔

شاعری پر اُس نے حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور عنصری

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے، جن کو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھلا کر پھر دربار میں لائیں، ایک موقع پر جب شہزادۂ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا، اور شعراء نے دربارِ عام میں قصائد پیش کیے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کیے[1]، غضائری کو دو شعروں پر دو توڑے دیئے، چنانچہ غضائری خود کہتا ہے ؎

مرا دو بیت بفرمودہ شہریارِ جہاں ۔۔۔ بداں صنوبرِ عنبر عذار مشکیں خال

دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم ۔۔۔ برغمِ حاسد و تیمار جد سگال نکال

عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ اُس کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔

ان واقعات کو ایک نکتہ چین محمود کے فضائل کے بجائے، اس کے معائب کے دفتر میں لکھے گا، اور واقعی، مدّاحوں اور خوشامد گویوں کی ایک فوج کثیر بہم پہنچانا اور ان پر زر و جواہر کا مینہ برسانا، فیّاضی نہیں، بلکہ اسراف اور سبک سری ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ محمود کی یہ فیاضیاں مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فن ادب و تاریخ کی ترقی کی غرض سے تھیں، اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا، لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے۔ اسلامی فتوحات، مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں، لیکن مسلمان خالدؓ و ضرارؓ کے بجائے رستم و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں، عبدالملک ولید، مقتدر، معتضد، معتصم، مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن جم و کیخسرو، کیکاؤس و فریدوں، افراسیاب و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے۔

عنصری نے ۱۸۰ شعروں کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں[2]، بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا، اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی، تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعراء نے اصل فن کو ترقی دی اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں، واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہار جذبات، قدرتی مناظر کی تصویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں، سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں، غزل البتہ رہ گئی، لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا، ابھی سے اِس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔

---

[1] مجمع الفصحاء تذکرۂ زینتی۔ [2] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔

محمودی شعراء اگرچہ بیشمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کرلیا تھا اور جو آسمانِ سخن کے سبعہ سیّارہ تھے یہ ہیں، عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضاری، فرخی، منوچہری۔

# عنصری

حسن بن احمد نام، ابوالقاسم کنیت، عنصری تخلص، بلخ کا رہنے والا تھا، آغاز شباب میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، چونکہ آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تجارت شروع کی، ایک دفعہ اسی ضرورت سے سفر کو نکلا، راہ میں ڈاکہ پڑا اور جو کچھ کائنات تھی سب جاتی رہی،

عنصری نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں تحصیل علم کے لئے فیس وغیرہ کا کچھ جھگڑا نہ تھا، ہر جگہ، ہر طرف بڑی بڑی درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں، اور جو شخص جس آزادی سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ سکتا تھا، عنصری نے تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا، اس لئے شاعری کو اپنا فن قرار دیا اور اسی ذریعہ سے سلطان محمود کے چھوٹے بھائی نصر بن سبکتگین کے دربار میں پہنچا، نصر نے جوہر قابل دیکھ کر محمود کے دربار میں تقریب کی، رفتہ رفتہ ملک الشعراء کا خطاب ملا، سلطان محمود نے حکم دیا کہ دربار کے تمام شعراء جن کی تعداد چار سو تھی، اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھائیں، اور جس کا کلام پیش ہو عنصری کی اصلاح کے بعد پیش ہو، بڑے بڑے نامور شعراء عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے تھے اور گراں بہا صلے پاتے تھے، محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت و مال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زرین کمر غلام، رکاب میں ساتھ چلتے تھے، اور جب سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان جو عموماً طلائی و نقرئی ہوتا تھا چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا، انتہا یہ کہ دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں[1]، اکثر شعراء نے عنصری کی دولتمندی کا ذکر حسرت و رشک کے ساتھ کیا ہے، خاقانی کہتا ہے ؎

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان ۔۔۔ ز زر ساخت آلاتِ خوان عنصری

محمود کے دربار میں چار سو شعراء تھے جن میں فرخی، عسجدی، غضاری، منوچہری جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں، لیکن یہ بات اسی کو حاصل ہوئی کہ سلطان محمود کا بقائے نام اسی

---

[1] عنصری کے حالات زیادہ تر مجمع الفصحاء و تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی سے لئے گئے ہیں؂

کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، نظامی سمرقندی کہتا ہے ؎

| | |
|---|---|
| لیسا کا خاکہ محمود دشش بنا کرد | کہ از رفعت ہمے با مہ ندا کرد |
| نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے | مدیح عنصری ماند است برجائے |

عنصری نے سلطان محمود کی وفات کے تقریباً دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کی جاتی ہے جن میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں قصائد کے سوا متورد مثنویاں بھی لکھی تھیں مثلاً وامق و عذرا، سرخ بت و خنگ، شہر و عین، لیکن آج بالکل ناپید ہیں)، اس زمانہ تک شاعری کا بڑا لازمہ بدیہی یعنی فن مجلس تھا، جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا، اسی قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا، اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی، عنصری اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، وہ نہایت پرگو اور برجستہ کہتا تھا، آتشکدہ میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر رات بھر میں ہزار شعر کہہ ڈالے اس کی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکروں میں کثرت سے ملتے ہیں:

سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی اگرچہ حد سے متجاوز تھی۔ لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا، ایک دن بزم عیش میں بادہ و جام کا دور تھا محمود خلاف عادت معمول زیادہ پیکر بدمست ہو گیا، اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی، اس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں، محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھ دے، ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی[1] صبح کو جب محمود سو کر اٹھا تو ایاز کی صورت دیکھ کر سخت مکدر ہوا، بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، ندما اور مقربین دم بخود تھے، آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تھا، عنصری کو بلا کر صورت واقعہ بیان کی، عنصری نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی۔

| | |
|---|---|
| گر عیب سر زلف بت از کاستن است | نہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است |
| وقت طرب نشاط و مے خواستن است | کاراستن سرو زپیراستن است |

یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج و غم کی کیا بات ہے، یہ تو اور خوشی کا موقع۔

---

[1] شعراء نے اس واقعہ سے مضامین پیدا کئے، مرزا صائب کہتے ہیں

| | |
|---|---|
| پا از گلیم خویش بباید دراز کرد | تیغ ستم بہ بیں چہ بزلف ایاز کرد |

*روایت صحیح ہو، لیکن منہ بھرنے میں جو بات ہے وہ دامن میں نہیں،

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی، عنصری نے برجستہ کہا۔

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست ۔۔۔ نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشتِ زریں و آمد ستاں خواست ۔۔۔ بازوے شہر یار را بر بست
نیش بگرفت و گفت عز علیک ۔۔۔ ایں چنیں دست را کہ یارد خست
سہر فرو بُرد و بوسہ بر داد ۔۔۔ وز سمن شاخ ارغواں برجست

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اوج ترقی کے زمانہ میں بھی جرّاحی و فصادی کا کام عیسائی کرتے تھے ایک دفعہ محمود، چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا، خفیف سا زخم آیا، عنصری نے فی البدیہہ کہا۔

شاہا! ادبے کن فلک بدخو را ۔۔۔ کاسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن ۔۔۔ ور اسپ غلط کرد، بمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے، ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اسکو بخش دیجیئے۔ دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالیئے، محمود نے اس حسن طلب کے صلہ میں گھوڑا عنصری کو دے دیا۔ عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی،

رفتم بر اسپ تا بزارش بکشم ۔۔۔ گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاؤ زمینم کہ جہاں برگیرم ۔۔۔ نے چرخ چہارم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا، گھوڑے نے کہا پہلے میرا عذر تو سُن لیجیئے، کچھ میں گاؤ زمین تو نہیں ہوں کہ عالم کا اٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں۔ کہ آفتاب کو لیئے پھروں۔

شاعر کے متعلق عنصری نے جو کام کیئے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

عنصری کی شاعری کی خصوصیات

(۱) قصیدہ میں مخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے۔ یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں، متاخرین کو ناز ہے کہ یہ نکتہ آفرینیاں اُنہیں کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ عنصری کے مخلص بھی متاخرین سے کم نہیں، ایک قصیدہ میں ابتدا سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے

* اس لیئے کہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ موزوں ہو جاتا ہے۔ محمود نے حکم دیا کہ عنصری کا منھ جواہرات سے بھر دیا چنانچہ تین دفعہ کیا گیا چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ منھ کے بجائے دامن بھرا گیا تھا۔ فیاضی کے مبالغہ کے لحاظ سے شاید یہی

اُس میں لکھتا ہے،

| | |
|---|---|
| هنوز دستند آں ماہ منوّر | خط، زلفین آں، مہ روے دلبر |
| یکے را سنبل نو رستہ بالین | یکے را لالۂ خود روے بستر |
| بہ روے و موے او بنگر کہ بینی | بہ آتش آذر، ہر دو آں را فعل آذر |
| یکے بے دود سال و ماہ و تیرہ | یکے بے نور روز و شب منوّر |
| مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی | دل و پاک و زبان مدح گستر |
| یکے بر مہر جاناں وقف کردم | یکے بر مدح شاہنشاہ کشور |

ایک اور قصیدہ ہے۔

| | |
|---|---|
| مہ آں آراستہ زلفش گرہ گردد، گہے چنبر | کہ آں پیراستہ جعدش ببارد مشک و گہ عنبر |
| شگفتہ لالہ رخسارہ۔ حجابِ لالہ چہّارہ | براز عاج و دل از خارہ، تن از شیر و لبانہ شکر |
| سمن بوے، شبہ موے، بلا جوے اجفا گوئے | پری زادے، پری روئے، پری چہرئے پری پیکر |
| ببر واز اسے دل از روئے، کہ گاہ آمد کہ حق جوئے | غزل چندیں چرا گوئی ز عشق آں بت دلبر |
| ثنا جوئے از غزل یا سُخ، کت ایں ہر دو بود فرخ | غزل بر ماہ زیبا رخ ثنا بر شاہ نیک اختر |

ایک قصیدہ سوال وجواب سے شروع کیا ہے اور اخیر تک یہ انداز قائم رکھا ہے۔
اُس میں نہایت خوبی سے مدح کی طرف رجوع کی ہے۔

| | |
|---|---|
| ہر سوالے کزاں گل سیراب | دوش کردم مرا بداد جواب |
| گفتم آتش براں رخت کہ فروخت | گفت آں کہ دل تو کرد کباب |
| گفتم اندر عذابِ عشق توام | گفت عاشق نکو بود بہ عذاب |
| گفتم از چیست روئے راحتِ من | گفت ہر دم، ز روی غمزہ شتاب |
| گفتم آں میر نصر ناصر دیں | گفت آں مالکِ قلوب و رقاب |
| گفتم اندر جہاں چو او دیدی | گفت نے و نخواندہ ام بکتاب |
| گفتم اعداے او دروغ زن اند | گفت ہمچوں مسیلمہ کذاب |
| گفتم از مدح او نیاسایم | گفت زینساں کنند اولوالالباب |
| گفتم او را چہ خواہم از ایزاد | گفت عمر دراز و دولت شاب |

ایک قصیدہ کو تشبیب سے شروع کیا ہے، معشوق کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے

او دمن ہر دو ہمے نازیم، نازمن بر است — کو بحسنِ خویش نازد من بہ مدح شہریار

ایک قصیدہ زلف کی تعریف سے شروع کیا ہے۔

اے شکستہ زلف یار، از بسکہ تو دستاں کنی — دست، دست لست، گر با ساحراں کیساں کنی

ہم زرہ پوشی و ہم چوگاں زنی برار غواں — خولیشتن را گہ زرہ سازی وگہ چوگاں کنی۔

نیستی دیوانہ، بر آتش چرا غلطی ہمے؟ — نیستی پروانہ، گرد شمع چوں جولاں کنی؟

زلف سے خطاب کرتے کرتے، اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے۔

دل نگہدار! اے تن از درد ش کہ دل باید ترا — تا ثنائے کدخدائے کشور ایراں کنی!

(۲) قصیدہ اگرچہ مداحی اور بھٹی کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے۔

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

گر نگویم قصیدہ با کے نیست — من خوشامدنے توانم گفت

لیکن عنصری نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہے، اس نے اکثر قصیدوں میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں، ایک قصیدہ میں جو ۲۰۷ شعروں کا ہے محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں[۱]۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

شنیدۂ خبر شاہ ہندواں جیپال — کہ بر سپہر بلندش ہمے بسود افسر

بداں صفت سپہے چوں شب سیاہ بزرگ — بدست ایشاں شمشیرہائے ہمچو سحر

چو دود تیرہ، درو آتشے زبانہ زناں — تو گفتئے کہ پراگندہ شد بدشت سفر

خدایگان خراساں بدست پیشاور — بحملہ بپراگند آں ہمہ لشکر

حکایت سفرِ مولتان ہمے دانی — وگر ندانی تاج الفتوح پیش آور

اگر ز دجلہ فریدوں گزشت بے کشتی — بہ شاہنامہ براں بر حکایت است سمر

ازاں سپس کہ درو ہم راندۂ پایاب — وزاں سپس کہ براں باد را نہ بود عبر

بہ مولتان شد و در رہ دو بست قلعہ کشاد — کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

بلاد و بت کدۂ شاں کشاد و سوخت ہمہ — بمیرد باد ہمہ تو دہائے خاکستر

چو باز گشت بہ یک تاختن بہ میمنہ شد — ازاں کہ بود خراساں ز رنجہا مضطر

---

[۱] تذکرۂ دولت شاہ میں لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں ۱۸۰ شعر ہیں، لیکن دیوان مروجہ میں اس سے کم ہیں

خوارزم کی فتح میں لکھتا ہے۔

بوقت آں کہ زمین تفتہ بدر ز باد سموم
ہوا چو آتش وگرداندرو بجائے شرار

فرو گذشت بآمویہ شہریار جہان
بہ فالِ اخترِ نیک و بہ نصرتِ دادار

ہمہ زمین شدہ اندروے ہندگاں گشمیر
ہمہ ہوا شدہ از عکس چاؤشاں فرخار

درآب در ہمہ غرقہ شدند چوں فرعون
چو برگزشت برآں آب، شاہ، موسیٰ وار

فراخ جیحول چوں کوہ شد زبسکہ درو
کلاہ و ترکش و زیں بود و جامہ و دستار

کسے کہ زندہ باند است ازاں ہزیمتیاں
اگرچہ تنش درست است، ہست چوں بکار

بہ مغزش اندر، تیغ است، اگر بود خفتہ
بہ چشمش اندر تیر است اگر بود بیدار

اگر بہ جنبد، بند قبائے او از باد
گماں کند کہ ہمے بر جگر خورد مسمار

اگر سوال کند، گوید اے سوار مزن،
وگر جواب دہد، گوید، اے ملک زنہار

اخیر شعروں میں شکست یافتہ فوجوں کی بدحواسی اور خوف زدگی کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے، کہتا ہے کہ جب یہ سوتے ہیں تو خواب میں ان کو ہر طرف تلواریں نظر آتی ہیں، اور آنکھ کھلتی ہے تو تیر ہی تیر دکھائی دیتے ہیں، قبا کا بند اگر ہوا سے جنبش کرتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ کوئی شخص کلیجے میں کیل ٹھوک رہا ہے اگر کچھ درخواست کرتا ہے تو یہ کہ میاں سوار! اب نہ مارنا، اور کچھ جواب دیتا ہے تو یہ کہ اے بادشاہ، پناہ دے۔"

(۳) مناظرِ قدرت، اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اس نے نہایت خوبی سے لکھے ہیں:

بہار

بہ نوروزی، ہمے دُرِ مارد و بت گر شود
تا ز صنعش ہر درختے لعبتے دیگر شود

باغ ہمچو کلبۂ بزاز پُر دیبا شود
باد ہمچوں طبلۂ عطار پُر عنبر شود

روئے بندد[۱] ہر زمینے حُلّۂ چینی شود
گوشوارہ ہر درختے رشتۂ گوہر شود

زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے
درخت کانوں میں سونے کے بندے ڈال لیتے ہیں

چوں حجاب لعبتاں خورشید را بینی کہ باز
گہ بروں آید ز میغ، گہ بہ میغ اندر شود

آفتاب، بھان متی کی پتلی بن گیا ہے
کہ کبھی بادل سے نکل آتا ہے، اور کبھی بادلوں میں گھس جاتا ہے

افسرِ سیمیں فرو گیرد، ز سر کوہِ بلند
باز مینا چشم، و دیبا روئے و مشکیں سر شود

پہاڑ نے چاندی کا تاج (برف) سر سے اتار کر رکھ دیا ہے
اور اس کی آنکھیں سبز، چہرہ پُرنگار اور سر مشکیں ہو گیا

مقصد کہ پہاڑ پر سبزہ، بنفشہ اور طرح طرح کے پھول پیدا ہو گئے۔

---

۱؎ نقاب کو کہتے ہیں

درخت نارنج، از خامۂ گوئیا شنگرف ... برنجیت است گسستہ مشت و زرنگار
زبرگ و بار ہمہ طوطیان پر آمند ... کہ برگ شان ہمہ پرّاست و بار شان منقار

نہر کی تعریف

مجرّہ وار یکے جوے اندرو گردد ... بر آب خضر بنہ کردہ، آب او بازار
(کہکشاں)
اگر بجنبد گوئی ہمے بجنبد جاں ... دگر بہ پیچد گوئی ہمے بہ پیچد مار
بسان قارون گاہے فرو شود بزمیں ... گہے شود بہوا برچو جعفر رضؓ طیار

ہاتھی کی تعریف

نہ چرخ اند، لیکن ہمہ چرخ گردش ... نہ کوہ اند، لیکن ہمہ کوہ پیکر
چو اندر ہوا، کوہ بر قوم موسیٰ ... چو بر قوم عاد آیت باد صرصر
چناں گردد، از عرض شاں سست گوئی ... بہ موج اندر آید ہمے بحر اخضر
تنگ راہ گیرند بر آب و آتش ... بدنداں بدّرند پولاد و مرمر
زمیں کوہ باشد چو آیند پیدا ... چو اندر گزشتند، چاہ مقعّر

صنائع و بدائع | یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن خال خال تھی اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع ہوتا، عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں، اور چونکہ بعض صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں، اور شعراء نے بھی تقلید کی، ایک عام شاہراہ پیدا ہوگئی چنانچہ ترصیع یعنی دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم مساوی الوزن ہونا یا ہم قافیہ ہونا اس قدر عام ہوا کہ قدماء کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصائد اسی انداز پر لکھے جاتے تھے۔ اور اور فیصدی ۸۰ شعروں میں یہ صنعت پائی جاتی تھی۔ لف و نشر، تقسیم سیاقۃ الاعداد، کو بھی رواج ہوا، لیکن نہ اس قدر قصائد کہ نہ گلے کا ہار بن جائیں، عنصری نے جس طرح ان صنعتوں کو برتا اُن کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

ترصیع شراب

درختے است گویا بہ مینا منقش ... پرندے ست گویا بہ لولو مشجّر
لوندہ است و رفتنش در مغز شیراں ... خورندہ است و خوردنش از مغز کافر
نہ وہم است و گفتنش چوں وہم بر دل ... نہ مغز است و بودنش چوں مغز در سر

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گردد، گہے چنبر ... گہ آں پیراستہ جعدش بیارد مشک، گہ عنبر
رُخ چوں تو شگفتہ گل، ہمہ گلبن برنگ گُل ... ہمہ شمشاد، پُر سنبل، ہمہ بیجادہ پر شکّر
بہ رواز نیکوے معنی، بہ غمزہ از جادوئے شوخے ... بہ چہرہ حجت مانی، بہ خوبی حاجت آذر

سمن بوے، شبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوے ۔۔۔ پر بزادے، پری دیدے، پری چہرے، پری پیکر

دل آرامی، دل آرائے، غم انجامے، غم افزائے ۔۔۔ سمکورو سے، نکورلے، یہ حسن اندر جہاں سرور

تمام قصیدہ اسی صنعت میں ہے، اور اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرائے مابعد نے التزاماً اس کے تتبع میں قصائد لکھے، سلیمان ساوجی، امیر خسرو اور قاآنی نے بعض اور خوبیاں اس میں اضافہ کیں، اور زیادہ حسن پیدا کر دیا، مثلاً قاآنی کہتا ہے۔

کنوں کز فشنبلید و ارغوان و یاسمن حاوہ ۔۔۔ چمن تو مین، دمن تکیں، زمیں آئین، زمان زیور

بہ صحن باغ و طرف راغ، و زیر سرو، و پائے جو ۔۔۔ بزن گام و بجو کام، بدہ جام، بکش ساغر

لف و نشر اور تقسیم کو اگرچہ عنصری نے بہت کم برتا ہے، لیکن نہایت خوبی اور سادگی سے برتا ہے۔

یا بہ بندد، یا کشاید، یا ستاند یا دہد ۔۔۔ تا جہاں باشد ہمے مرشاہ را ایں یادگار

آنچہ بستاند ولایت، آنچہ بدہد خواستہ ۔۔۔ آنچہ بندد دست دشمن، آنچہ بکشاید حصار

مبالغہ، اس میں بھی عنصری نے کچھ کمی نہیں کی، لیکن اس وقت تک تکلف اور بناوٹ کو اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی، اس لئے متاخرین کے مقابلہ میں اس کے مبالغے پھیکے معلوم ہوتے ہیں مثلاً وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے۔

شگفت آید از مرکب تو خرد را ۔۔۔ کش از باد طبع ست و از خاک منظر

بہ گام پسیں بر رود گر برانے ۔۔۔ بہ نقر بیش از باختر تا بہ خاور

بہ عبتق کند کم ز دریا بہ دریا ۔۔۔ نہ منزل کند کم، زکشور بہ کشور

مضمون آفرینی

بہ نور و ظلمت ماند، زمین و ابر ہمے ۔۔۔ بہ در و مینا ماند سبز شک ابر گیا

فریفتہ است زمیں ابر تیرہ را کہ ازو ۔۔۔ ہمے ستاند در و ہمے دہد مینا

یعنی زمین اور بادل نور ظلمت کے مشابہ ہیں، اور قطرۂ باراں اور گھاس، گویا موتی اور سبز شیشے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بادل زمین کے فریب میں آگئے ہیں، کیونکہ زمین سبز شیشہ دے کر اس کے عوض بادلوں سے موتی لیتی ہے۔

ہمانا کہ خورشید رنگ رخش را ۔۔۔ بدزدد کہ بخشد بہ یاقوت احمر

عام خیال یہ ہے کہ آفتاب، جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے تو وہ یاقوت بن جاتا ہے، عنصری کہتا ہے، کہ آفتاب دراصل معشوق کے چہرے کا رنگ چرا آتا ہے

اور یاقوت کو پناہ دیتا ہے۔

زمانِ گزشتہ است کش در نیابی　　چو بگذشت از پیش چشم تو دیگر
برجعت برآں گونہ باشد کہ گوئی　　ہمے بازگردد زمانہ مکرر

یعنی جب گھوڑا سامنے سے نکل جاتا ہے تو گویا گزرا ہوا زمانہ ہے جس کو تم پا نہیں سکتے، اور جب چکر لگا کر آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے پلٹا لیا۔

# فرّخی

علی نام، ابوالحسن کنیت، فرّخی تخلص، سیستان وطن، باپ کا نام قلوغ تھا جو امیر خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں ملازم تھا، بچپن میں ادب اور موسیقی کی تعلیم پائی چنانچہ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا، معاش کی یہ صورت تھی کہ ایک زمیندار کی ملازمت کرتا تھا جسکے معاوضہ میں سالانہ دو کیل غلہ اور سو درہم مقرر تھے، یہ مختصر سی آمدنی اس کی سادہ زندگی کے لئے کافی تھی لیکن چند روز کے بعد اس نے امیر خلف کی ایک لونڈی سے شادی کی جس کی وجہ سے خرچ بڑھ گیا، آقا سے تحریری درخواست کی کہ تنخواہ میں ۵۰ درم کا اضافہ کردے، اور غلہ کی مقدار دو سو کیل کی بجائے تین سو کردی جائے، آقا نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ اس قدر حاضر ہے اور اس سے زیادہ کا مجھ کو مقدور نہیں۔

فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کرلی تھی، شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعہ سے یہ مشکل حل ہوگی۔ چنانچہ لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ اس فن کا کون بڑا قدردان ہے۔

ابوالمظفر چغانی، اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا، اور نہایت فیاض طبع اور قدردانِ سخن تھا، فرخی اس کی فیاضی اور قدردانی کا شہرہ سن کر چغان میں آیا، چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتدا اسی واقعہ سے کی ہے۔

با کاروانِ حلہ برفتم ز سیستان　　با حلۂ تنیدہ ز دل، بافتہ ز جان

ابوالمظفر کو گھوڑوں سے بہت شوق تھا، اور بڑے اہتمام سے ان کی پرداخت و تربیت کرتا تھا، اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے ہمیشہ چراگاہ میں رہتے تھے۔ سال میں

---

ل یہ تمام واقعہ اگرچہ تمام تذکروں میں منقول ہے لیکن سب سے زیادہ تفصیل چہار مقالہ میں ہے، اور میں نے گویا اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ان بچھیروں کا جائزہ لیتا تھا۔ اور اُن کو داغ کرتا تھا، فرخی جب بلخ پہنچا۔ تو معلوم ہوا، کہ ابوالمظفر داغ گاہ میں گیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے عمید اسعد جو ابوالمظفر کا مختار کل تھا، موجود تھا، موجود تھا، فرخی اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ شاعر ہوں، عمید نے نظر اٹھا کر دیکھا تو فرخی کے چہرہ مہرہ ہیئت، وضع قطع، کسی چیز کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، بھدا اڈیل ڈول ڈھیلا ڈھالا کرتہ، جیب کے دونو طرف چاک، سر پر بڑا سا پگڑ، سخت متعجب ہوا، تاہم حسن اخلاق کے لحاظ سے کہا کہ میں تم کو امیر کے دربار میں لے چلوں گا، لیکن پہلے داغ گاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ لاؤ، اس کے ساتھ، داغ گاہ کی صورت کا نقشہ کھینچ کر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہوتا ہے، جابجا چشمے بہتے ہیں، بے تکلف احباب مل بیٹھتے، گاتے بجاتے ہیں، شراب پیتے جاتے ہیں، بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں کمند لے کر بیٹھتا ہے، شراب پیتا جاتا ہے۔ اور لوگوں کو گھوڑے انعام دیتا جاتا ہے۔

فرخی نے رات بھر میں قصیدہ تیار کر کے صبح کو عمید کے سامنے پڑھا۔

چوں پرند نیلگوں، بر روے پوشد مرغزار — پرنیانِ ہفت رنگ، اندر سر آرد کوہسار
خاک را چوں نافِ آہو مشک زاید بے قیاس — بید را چوں پر طوطی برگ روید بے شمار
دوش وقت نیم شب بوے بہار آورد باد — حبذا باد شمال و فرخا بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں — باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوے بیضا دارد اندر مرسلہ — ارغواں لعل بدخشاں دارد، اندر گوشوار
باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نماے — آب مروارید گوں، و ابر مروارید بار
داغہاے شہریار اکنوں چناں خرم شود — کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی۔ چوں سپہر اندر سپہر — خیمہ اندر خیمہ بینی۔ چوں حصار اندر حصار
ہر کجا خیمہ است، خفتہ عاشقے با دوست مست — ہر کجا سبزہ است، شاداں یارے از دیدار یار
سبزہا با بانگ چنگ مطرباں چرب دست — خیمہا با بانگ نوشِ ساقیان مے گسار
عاشقاں بوس و کنار و نیکواں ناز و عتاب — مطرباں رود و سرود و خفتگان خواب و خمار
بر در پردہ سرائے خسرو پیروز بخت — از پے داغ آتشے افروختہ خورشید وار
داغہا چوں شاخہاے بسد یاقوت رنگ — ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار
ریدکاں خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف — مرکباں داغ ناکردہ قطار اندر قطار

روی ہاموں، سبزہ چوں گردوں ناپیدا کراں
روئے صحرا، سادہ چوں دریائے ناپیدا کنار

اندراں دریا سماری، واں سماری جانور
اندریں گردوں ستارہ واں ستارہ بیدار

خسرو فرخ سیر، برباره، دریا گذر
با کمند اندر میانِ دشت چوں اسفندیار

گردن ہر مرکبے چوں گردن قمری بہ طوق
از کمند شہر یار شہر گیر شہر دار

ہر کرا اندر کمند شصت بازی در فگند
گشت داغش بر سرین شانہ درویش نگار

روز یک نیمہ، کمند در مرکبان تیز تگ
نیم دیگر مطربان و بادۂ نوشیں گوار

عمید نے فرخی کو ساتھ لیا، اور ابوالمظفر کے پاس جاکر اس ترکیب سے پیش کیا کہ دقیقی کے بعد آج تک اس پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہؤا - یہ کہہ کر سارا واقعہ بیان کیا- ابوالمظفر نے فرخی کو دربار میں مناسب موقع پر جگہ دی، شراب کا دور چل رہا تھا - دو تین دور ہو چکے تو فرخی اٹھا اور درد آمیز لہجہ میں یہ قصیدہ پڑھا - ع با کاروان حلّہ برفتم ز سیستان - ابوالمظفر خود شاعر تھا، حد سے زیادہ مسرور ہؤا، اور فرخی سے کہا کہ ہزار کمیت بچھیرے سامنے ہیں جس قدر تم سے پکڑے جاسکیں تمہارے ہیں، فرخی شراب سے بدمست تھا، فوراً اُٹھا، دستار سر سے پھینک بچھیروں کی قطار میں گھس گیا، وہ بھاگ کر ادھر ادھر پھیل گئے، فرخی، ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، تھک کر چور ہو گیا، اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا، صبح کو دن چڑھے اُٹھا ابوالمظفر نے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر، فرخی کو دربار میں طلب کیا، اور اسپ خاصہ، ایک خیمہ، تین شتر، پانچ غلام، اور پہننے کے کپڑے انعام دیئے، دریافت سے معلوم ہؤا کہ فرخی نے جس جگہ پر ہاتھ ڈالا تھا، اس میں بیالیس بچھیرے تھے، ابوالمظفر نے وہ بھی انعام میں دیدیئے - چند روز کے بعد فرخی بڑے سروسامان سے سلطان محمود کے دربار میں پہنچا، سلطان نے نہایت قدردانی کی اور شعرائے خاص میں داخل کیا، ایک موقع پر اسپ خاصہ عنایت کیا تو فرخی نے یہ اشعار شکرگذاری میں لکھے -

اسپے کہ چناں شاہ دہد اسپ نباشد
تا جے بود آراستہ از لولوئے شہوار

دشمن کہ بریں ابلق رہوار مرا دید
بے صبر شد و کرد غم خویش پدیدار

اس وقت باوجود تقرب اور منصب ندامت کے فرخی کو دربار میں کمر بند باندھنے کی اجازت نہ تھی، کیونکہ یہ لباس امرائے فوج کے ساتھ مخصوص تھا، فرخی نے نہایت خوبی سے اس قصیدہ میں اس عہدہ کی آرزو کی ہے،

گفتا کہ بہ میراں وبہ سرہنگاں | ماتی | امروز کلاہ و کمرت باید ناچار
گفتم کہ چہ دانی کہ شب تیرہ چہ زاید | بشکیب وصبوری کن تاشب بہ نہد پائے
من تنگدلی پیشہ نگیرم کہ بزرگاں | کس رابہ بزرگی نرسانند بیک بار

یعنی دشمن نے مجھ سے کہا کہ اب تو تمہارا ٹھاٹھ امراء کا سا ہے، اب کمر بند و کلاہ بھی ملنا چاہیئے، میں نے کہا تجھ کو کیا خبر ہے کہ کل کیا ہوگا؟ جس نے مجھ کو اسپ خاصہ کے قابل سمجھا، وہ اس کا مستحق بھی سمجھے گا۔ میں دل گرفتہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ سلاطین کا یہ دستور نہیں کہ کسی کو ایک دم سے بڑے رتبہ پر پہنچا دیں، بالآخر فرخی کی دولت وجاہ کی یہ نوبت پہنچی کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو بیس بیس کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔

**ایاز** جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدردان تھا اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا۔ فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے بالآخر سلطان صاف ہوگیا، اور فرخی بدستور دربار میں آنے جانے لگا[۱]

اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ شعراء محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے، اس میں علانیہ ایاز کے حسن ومعشوقی کا ذکر کرتے تھے، اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے۔

امیر جنگجو ایاز اُو بیاق | دل وبازوئے خسرو روز پیکار
زنان پارسا از شوق گردند | بکابی کردنی اورا خریدار
زبہ خیرہ بدو دل داد محمود | دل محمود را بازی مپندار
بجز او در پیش سلطان نیز کس بود | جز او سلطان غلامان داشت بسیار
اگر چوں خیر یک تن بود آنجا | نہ چندیں بد مرا ورا گرم بازار

**غضاری** نے محمود کی فرمائش سے ایاز کی تعریف میں دو شعر لکھ کر پیش کئے تو محمود نے دو ہزار اشرفیاں انعام میں دلوائیں چنانچہ غضاری ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں | براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم | برغم حاسد تیار بد سگال نکال

**فرخی** نے صنائع وبدائع شعری میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ترجمان البلاغۃ ہے۔

ش... ۱ بو دطواط نے حدائق السحر میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "لغو کتاب ہے"، بظاہر تعجب

---

[۱] مجمع الفصحاء

ہوتا ہے۔ کہ ایران کے شعرا ابتداہی سے صنائع وبدائع کی طرف کیونکر مائل ہوئے، لیکن حقیقت میں یہ تعجب کی بات نہیں، شاعری کا جو نمونہ فارسی شعراء کے پیش نظر تھا۔ وہ عربی شاعری تھی، عرب میں خود اس زمانہ میں صنائع وبدائع کی بدعت ایجاد ہو چکی تھی اور عبداللہ بن معتز کی کتاب البدیع جو اس فن کی پہلی کتاب لکھی، لیکن خود ان تکلفات سے قطعاً آزاد ہے، فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی

کلام پر رائے

فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، اور سلاست وروانی ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔ کہ اس ابتدائی زمانہ میں اس نے زبان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گذر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے۔ گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، فرخی سے اس کا موازنہ نہ کرو، صاف نظر آئے گا جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی، فرخی کو اس وقت حاصل تھی، رمضان اور عید کے ذکر میں قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے۔

دلکا! ہیچ خبر داری کاں ترک پسر
با من از ناز دگر بار، چہ آورد بسر

لب نوشیں آمد، شب دوشیں بسرائے
حلقہ بر در زد و برجستم و بگشودم در

گفت قاآنیکا! تا کے خسپی بہ سرائے
خیز کز روزہ شد او ضائع زیر و زبر

غالباً مست چناں خفتہ اندر رمضان
کز مہ روزہ واز روزہ ترا نیست خبر

گفتم اے ترک دلارام مگر باز آمد
رمضان آں مہ شاہد کش و زاہد پرور

گفتم آمے رمضان آمد و گویند کہ خلق
رقم از بار خدا دارم دانہ پیغمبر

وقت آں آمد کاں اعلک زبعد نماز
ہمچو بوزینہ بیکبار جہد از منبر

اسی بحر و قافیہ میں فرخی کا قصیدہ دیکھو،

رمضان رفت، در ہے دور گرفت اندر بر
خنک آں کس رمضان را بہ سزا برد بسر

بس گرامی بود ایں ماہ ولیکن چہ کنم
رفتنی رفتہ بہ، در وے نہادہ بہ سفر

رمضان گر بشد از راہ فرا آمد عید
عید فرخندہ زماہ رمضان نیکوتر

گاہ آں آمد کز شادی پر گردد دل
وقت آں آمد کز بادہ گراں گردد سر

بادۂ روشن و آسودہ و صافی چو گلاب
ساقی دلبر و شائستہ و شیریں چو شکر

مطربا! آں غزل نغز دلاویز بیار
ورنہ دانی بشنو تا غزلے گویم تر

لے دریغا دل من کاں صنم سیمیں بر
دل من برد و مرا از دل او نیست خبر

او دلے داشت گرامی و دل دیگر یافت
کاشکے من دلکے یافتمے نیز دگر

اسی بحر اور قافیہ میں اس کا ایک اور قصیدہ ہے، جو سراپا محاورہ اور روزمرّہ ہے

ترکِ بُت روے من، از خواب گراں دارد سر    دوش مے دادہ است از اوّل شب تا بسحر
میرا پری چہرہ معشوق نیند سے سر گراں ہے    کل شام سے صبح تک شراب پلاتا رہا ہے
من بچشم اورا دو بار نمودم کہ بخسپ    او ہمے گفت بسر، تا برم ایں دور بسر
میں نے دو دفعہ آنکھ سے اشارہ کیا کہ سو رہو۔    لیکن یہی کہتا رہا کہ یہ دور تو ختم ہونے دو
شب بسر برد بہ مے دادن و ننشست و نخفت    دل من جُست کہ ننشست و نخفت آں دلبر
ساری رات شراب پلانے میں گزاری، نہ بیٹھا نہ سویا    یہ میری خاطر داری تھی کہ سویا نہیں اور کھڑا رہا
حیلہ سازد کہ مے افزوں خورد از نوبت خویش    در تواند بخورد نوبت یاراں دگر
چالاکی کرکے چاہتا ہے کہ اپنے حصہ سے زیادہ پی جائے    اور اُس کے امکان میں تو اوروں کا حصّہ بھی اڑا لے
کیست آں کو؟ نہ بہ دل بچنیں خدمت دوست    کیست آں کو؟ نہ کشد بار چنیں خدمت گر

---

مدح کے تشبیب میں فتوحات کا ذکر آتا ہے۔

خسرو ما بہ شکار ملکاں تاختہ بود    ما ز اندیشۂ او خستہ دل و خستہ جگر
خسرو از راہ دراز آمد با نہمت و کام    ملک از جنگ عراق آمد با فتح و ظفر
قلعہ ہا کندہ و بنشاندہ بہر شہر سپاہ    جنگہا کردہ و بنمودہ بہر جائے ہنر

دیگر

اے پسر! گر دل من کرد ہمے خواہی شاد    از پس بادہ بمن بوسہ ہمے باید داد
نقل با بوسہ بود، بادہ دہی نقل بدہ    دیر گاہ است کہ ایں رسم نہاد آں کہ نہاد
گر ہمے گوئی دو بوس از دگرے نیز بخواہ    تو مرا از دگراں بردہ اے حور نژاد

یہ بھی فرخی کے خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے تو اس کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، ایک قصیدہ میں مجلس عیش کی خیالی تصویر کھینچی ہے۔

سرو ساقی و ماہ رود نواز    پردۂ بستہ در رہ شہناز
(شہناز ایک راگنی کا نام ہے،)
زخمہ رود زن نہ سست و نہ تیز    زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
(یعنی سر نہ بہت اونچے نہ بہت نیچے)
مجلسے خوب خسروانی واز (شاہانہ)    از سخن چیں، تہی و از غمّاز
بوستانے ز لالہ و سوسن    ہمچو روے تذرو و سینہ باز

دوستان مساعد و یک دل — کہ نواں گفت پیش ایشاں راز
ماه روئے نشاند اندر پیش — خوش زبان و موافق و دمساز
جعد او بر پرند کشتی گیر (زلف یعنی چہرہ) — زلف او بر حریر چوگاں باز
بادۂ چوں گلاب روشن تلخ — مانده در خم ز گاه (وقت) آدم باز
از چنیں مجلس و چنیں باده — ہیچ زاہد مرا ندارد باز

سلطان محمود نے ایک باغ بڑے سرو سامان سے تیار کرایا تھا، گلہائے رنگ رنگ کے تختہ زار، جا بجا جدولیں، دو طرفہ سرو شمشاد، ایک طرف مصنوعی خوشنما جھیل اس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے تیرتی پھرتی تھیں، تصویر خانہ میں محمود کی مجسم تصویریں، کہیں برچھا ہاتھ میں لئے ہوئے شکار کھیل رہا ہے، کہیں بزم عیش میں بیٹھا ہے اور شراب کا دور چل رہا ہے فرخی اس باغ کا نقشہ دکھاتا ہے۔

بہ فرخنده فال و بہ فرخنده اختر — ز نو باغ میخواست شاہِ مظفر
درو مسکنِ ماہرویانِ مجلس — درو خانۂ شیر گیرانِ لشکر
کجا جائے بزم است گلہائے بیحد — کجا جائے صید است مرغانِ بیمر
رواں گرد بر گرد رعنا درختاں — تذروان، آموختہ مادہ و نر
یکے کاخ شاہانہ اندر میانش — سر کنگرہ بر کشادہ دو پیکر
بہ کاخ اندرون صفہائے مصفا — در صفہا ساختہ سوئے منظر
یکے ہمچو دیبائے چینی منقش — یکے ہمچو ارژنگ مانی مصوّر
نگاریده در چند جا مصوّر — شہِ شرق (سلطان محمود) را اندراں کاخ پیکر
بہ یکجائے در صید، در دست، ژوبین — بہ یک جائے در بزم بر دست ساغر
ازاں کاخ فرخ چو اندر گذشتی — یکے رود آب اندرو ہمچو شکر
نہ چرخ است اجزائے او چوں ستارہ — نہ ابر است و آوائے (آواز) او ہمچو تندر
اگر بگذرد بر سرش مرغ موجش — بیالاید اندر ہوا مرغ را پر
بدو بینیاں بہ باغ اندراں تذروے — یکے ژرف دریا مر آں را برابر
بدو اندراں ماہیاں چوں عروساں — بگوش اندروں پُر گہر حلقۂ زر
مکانے بر آوردہ پہلوے دریا — بداں، تا براں مے خورد شاہ صفدر

یمینِ دُوَل شاہ محمود غازی    امینِ ملل خسرو بندہ پرور

ابوالمظفر چغانی کے دربار میں جب اس نے جانا چاہا ہے تو راہ میں بہت صعوبتیں پیش آئیں، قصیدہ میں تمام حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں اور دیکھو مدح کی تمہید کا پہلو کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے۔

رہے صعب، و شبے تاریک و تیرہ    ہوا چوں قیر وزدہ ہاموں مُقیّر
ہوا اندودہ رخسارہ بدودہ    سپہر آراستہ چہرہ بہ گوہر
گماں بُردی کہ باد اندر پراگند    بروئے سبز دریا برگ عبہر
(یعنی یہ آسمان ۱۲ یعنی ستارے)
مجرہ چوں بدریا راہِ موسےٰ    کہ اندر قعر او بگذشت لشکر
زمانے رفت و سر بر زد مہ از کوہ    برنگ روئے مہجوراں مزعفر
بہ ریگ اندر ہمے شد بادہ تازاں    چہ در غرقاب مرد آشنا در (تیراک)
(گھوڑا) شکم مالاں بہ ہاموں در ہمے رفت    شدہ ہاموں بزیر آں مقعّر
دمندہ اژدہاے پیشم آمد    خروشان و بے آرام و زمیں در
گرفتہ دامن خاور (یعنی دریا) بدنبال    نہادہ بر کرانِ باختر سر
بباران بہاراں گشتہ فربہ    بگرماے حزیراں گشتہ لاغر
مدیح شاہ بر جیحوں بخواندم    برکا بانگ از آب اللہ اکبر
کہ من گردہ کف را داد ویم    کہ تو مدحش ہمے بر خوانی از بر
بفرِ شاہ از جیحوں گزشتم    یکے موے از تن من نا شدہ تر
وزاں جا تا بدیں درگاہ گفتی    گشادستند مر فردوس را در
ہمہ بالا پُر از دیباے رومی    ہمہ پستی پُر از کالاے ششتر (نام شہر ۱۲)
تو گفتی ہیکل (بتخانہ) زردست گشتہ است    زبس لالہ ہمہ صحرا سراسر

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی، اس سے پہلے بھی یہ صفت موجود تھی لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کر دی، اور آیندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مورخ بے کم وکاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے۔

---

۱؎ بے کی یٰ ظاہر نہیں ہوتی۔ اور یہ قدما کی زبان ہے۔

سومنات کی فتح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اُس کا حال بیان کیا ہے

گمان کہ برد؟ کہ ہرگز کسے زراہِ طراز
یہ کس کو خیال تھا کہ کوئی شخص طراز کی راہ سے
بہ سومنات برد لشکرے چنیں لشکر
سومنات پر فوج لیجا سکتا ہے اور فوج بھی ایسی فوج

ہوائے آں وزم وبادِ آں چو دود جحیم
راستے میں ہوا ایسی خراب جیسے دوزخ کا دھواں
زمین آں سیہ و خاک آں چو خاکستر
زمین بالکل سیاہ اور خاک جیسے راکھ

ہمہ درخت، و میانِ درخت خار کشن
تمام جھاڑیاں اور جھاڑیوں کے کانٹے
نہ خار بلکہ سنانِ خلندہ و خنجر
کانٹے نہیں بلکہ چبھنے والی برچھیاں اور خنجر

نہ مرد را سرِ آں کاندراں نہادے پے
نہ آدمی کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ قدم رکھے
نہ مرغ را دلِ آں کاندراں کشادے پر
نہ پرند کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ اُڑ سکے

عجب تر اینکہ ملک را ہمے چنیں گفتند
سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ کہ لوگ بادشاہ سے کہتے تھے
کہ اندریں رہ ماردو سر بود بیمر
کہ اس راہ میں دو مونہے سانپ بے شمار ہیں

بہ شب چو خفتہ بود مرد سر برآرد مار
آدمی جب رات کو سوجاتا ہے تو یہ سانپ نکلتے ہیں
ہمے کشند نفس خفتہ تا برآید خور
اور دھوپ نکلنے تک پھُنکار مارتے ہیں

چو خور برآمد و گرمی بہ مردِ خفتہ رسد
جب آفتاب نکل آتا ہے اور آدمی کے بدن کو گرمی پہنچتی ہے
سبک نہ گردد ازاں خواب تاگہ محشر
تو آدمی ٹھنڈا ہوکر رہ جاتا ہے اور قیامت تک اُٹھ نہیں سکتا

بدیں درشتی و زشتی رہے کہ کردم یاد
ایسے سخت اور خراب راستے سے جس کا میں نے بیان کیا
گزشت شاہ بتوفیقِ خالقِ اکبر
بادشاہ خدا کی توفیق سے گزر گیا۔

بروز بر پس ماندگاں وگم شدگاں
پیچھے رہ جانے والوں کے لئے
میان بادیہ ہا حوضہائے چوں کوثر
جنگل میں حوض تیار کرا دیئے تھے،

بداں رہ اندر چندیں حصار شہر بزرگ
سینکڑوں قلعے اور شہر جو راہ میں پڑے
خراب کرد، بکند اصل ہر یک از بن و بر
برباد کر دیئے اور ان کی جڑ کھود کے پھینک دی

نخست لاردہ کز روئے برج و بارہ او
پہلا قلعہ لاردہ تھا جس کے برج اور دیوار سے
چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر
پہاڑوں کے برابر لوہا اور پتھر برستا تھا

چہ مندھیر کہ در مندھیر حوضے بود
اور مندھیر کا کیا کہنا، جس میں ایک ایسا حوض تھا
چنانکہ خیرہ شدے اندرو دو چشم فکر
جس کو دیکھ کر عقل کی آنکھوں کو چکا چوندھ لگ جاتی تھی

فراخ پہنا حوضے بہ صد ہزار عمل      ہزار بتکدۂ خرد گرد حوض اندر

نہایت چوڑا حوض جس میں ہزاروں کاریگریاں کام میں آئیں      ایک ہزار چھوٹے چھوٹے بتخانے اس کے اندر تھے

یکے حصار قوی بر کرانِ شہر و درو      ز بت پرستان گرد آمدہ یکے محشر

شہر کے کنارے پر ایک قلعہ تھا،      جس میں بت پرست ٹھٹ کے ٹھٹ اکٹھے تھے

فریضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے      بہ آب گنگ و بہ شیر و بہ زعفران و شکر

اُس بت کو لازمی طور پر ہر روز،      گنگا کے پانی اور دودھ اور زعفران اور شکر سے دھوتے تھے

شکار میں قمرغہ کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے، یعنی کسی بڑے جنگل میں جہاں کثرت سے شکاری جانور ہوتے تھے، چاروں طرف آدمیوں کی صفوں کو پھیلا کر ایک بڑا حلقہ قایم کر لیتے تھے، پھر حلقہ کو بتدریج چھوٹا کرتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چار میل کی وسعت رہ جاتی تھی، اور تمام جانور سمٹ کر اتنے ہی دور میں آ جاتے تھے۔ پھر ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے، اکثر مارے جاتے تھے، بہت سے زندہ بھی گرفتار ہوتے۔ سلطان محمود بھی اس طریقے سے اکثر شکار کھیلا کرتا تھا فرخی نے ایک قصیدہ میں اس کا سماں دکھایا ہے۔

اے ز جنگ آمدہ و روئے نہادہ بہ شکار      تیغ و تیر تو ہمہ سیر نگر دیدہ ز کار

ہر چہ در ایران پرندہ، و دد و دامی بود      ہمہ لاگر و ہم کردۂ و ریک دیوار

گرد ایشاں پرہ بستی مانند عقاب      ناں بروں رفت ندانست یکے از ہیچ کنار

در دویدند سوے تو بہ قطار از سرِ کوہ      باز گسترد سے در دامن گہ شاں بہ قطار

بامداداں ہمہ کہسار پر از وحشی بود      شامگاہاں ہمہ پرداختہ بود از کہسار

در زمانے، ہمہ آں دشت زخونِ دد و دام      لعل کردے چو گلستانے ہنگام بہار

خواہمی من کہ بجایستے بہرامِ امروز      تا بدیدے و بیاموختے از شاہ شکار

واقعہ نگاری کا انداز فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصاید کی تشبیب میں جو در اصل غزل ہوتی ہے، یہ انداز قائم رہتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب میں لکھتا ہے۔

دوش متواریک بہ وقت سحر      اندر آمد بہ خیمہ آں دلبر

چنگ در بر گرفت و خوش بنواخت      واز دو بُسّد فرو فشاند شکر

پنج شش جام خورد و دیر گل گشت      روے آں روے نیکواں یکسر

مست گشت واز بہر خفتن ساخت      خویشتن را کنار من بستر

زلف مشکیں بروے در پوشید      دست من زیر کرد، و زلف زیر

زلف اورا بدست بگرفتم — زنخ گرد او، بدست دگر
راست گفتی، گرفتہ بُد چاکر — گوی و چوگاں شہ بدشت اندر

دیکھو تشبیب سے مدح کی تمہید کس خوبی سے پیدا کی ہے

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں، اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں، لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا، وہ نہ صرف پُر درد اور پر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں۔

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اُس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اُٹھ گیا

۲۔ اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے، اس کا ذکر کیا جائے۔

۳۔ اُس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو۔ کہ انتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اُس کے مرنے کی ابھی خبر نہیں، اور وہ ابتک اس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی کرتا تھا۔

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، اس کے ساتھ الفاظ بندش اور طرز ادا اس قدر موثر ہے۔ کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار — چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار
غزنین اب وہ نہیں ہے جو میں نے پارسال دیکھا تھا — اس سال کیا پیش آیا۔ کہ وہ حالت بالکل بدل گئی

کویہا بینم پر شورش و تا سر تا سر کوے — ہمہ پُر جوشن و جوشن در او پُر خیل و سوار
دیکھتا ہوں کہ تمام گلیوں میں شور برپا ہے اور اس سرے سے اس سرے — جوشن پوش گھوڑوں اور سواروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں

مہتراں بینم بر روے زناں ہمچو زناں — چشمہا کردہ ز خون نابہ برنگ گلنار
بڑے بڑے سردار عورتوں کی طرح منہ پیٹ رہے ہیں — اور ان کی آنکھیں خون سے رنگین ہو گئی ہیں

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا — دشمنے روے نہاد ست درین شہر و دیار
شاید اس سال بادشاہ جہاد سے واپس نہیں آیا — اس وجہ سے ملک میں کوئی دشمن آ پہنچا ہے

سیر مے خوردہ مگر دوی، کہ نخفتہ ست امروز — دیر تا خاست مگر رنج رسیدش ز خمار
غالباً رات بہت شراب پی گیا اسلئے ابتک سو رہا تھا — چونکہ خمار کی تکلیف ہے اس لئے آج دیر میں اُٹھے گا

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند — ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

اے بادشاہ اٹھ! کہ بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں — جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیئے اور تحفے لائے ہیں

کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا — خفتی خفتنی - کہ خواب نگروی بیدار

کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے — تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا

خفتنِ بسیار اے خواجہ خوے تو نبود — ہیچکس خفتہ ندیدہ است ترا زیں کردار

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی — کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہیں دیکھا تھا

یکدمک بارے در رفاقہ بایست نشست — تا بدیدند روے تو عزیزاں و تبار

ذرا دیر تو تجھ کو دربار میں آکر بیٹھنا چاہیے تھا — کہ عزیز اور قریب تیرا چہرہ دیکھ لیتے

بہ حصار از فروغ و بیم تو رفتند شہاں — تو شہا از فروغ و بیم کہ رفتی بہ حصار؟

تیرے ڈر سے تو تمام سلاطین قلعوں میں بھاگ کر چھپ گئے — تو کس کے ڈر سے قلعہ میں بھاگ کر چھپتا ہے

شعرا را بتو بازار بر افروختہ بود — رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

تیرے دم سے شاعروں کا بازار گرم تھا — تو گیا، اور وہ بازار بھی جاتا رہا

صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا کرنا ایک لطیف صنعت ہے، فرخی اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت آدم ؑ نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو اُن کے کپڑے خود بخود اُتر گئے اور وہ بالکل برہنہ رہ گئے، فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا۔

مگر درخت شگوفہ گناہ آدم کرد — کہ از لباس چو آدم ہمے شود عریاں

نوشیرواں نے زنجیر عدل قائم کی تھی یعنی ایوان شاہی میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی کہ جس کسی کو شکایت ہو وہ زنجیر آکر ہلا دے، زنجیر کے ہلنے کے ساتھ وہ کسی حالت میں ہوتا، باہر نکل آتا تھا، دیکھو فرخی اس سے مضمون پیدا کرتا ہے۔

من چہ مظلومم، از سلسلۂ نوشیرواں — اندر آویختہ زاں سلسلۂ زلف دراز

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے فرخی نے اس سے تشبیہ کا کام لیا

پے بازیٔ گوے شد خسرو — بر یکے تازی اسپ کہ پیکر

راست گفتی بہ بادئ بر جم برد — گر بود باد را ستام بزر

حضرت موسیٰ جب رود نیل پر پہنچے تو دریا بیچ میں سے پھٹ کر سیدھی سڑک نکل آئی جس سے تمام بنی اسرائیل پار اُتر گئے، فرخی کہکشاں کی تعریف میں کہتا ہے۔

مجرد چوں بپیمایا رہ مولٰی … کہ اندر قعر او بگزشت لشکر

صنائع و بدائع، عارض سخن کے داغ پائے جاتے ہیں لیکن چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتے، الف و نشر اور صنعت تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے۔

در رگ و اندر تن و اندر دل و اندر چشم … خواب و صبر و روح و خوں را اسے مرا افتاد انقلاب
رنج دارد جائے خون و درد دارد جائے روح … عشق دارد جائے صبر و آب دارد جائے خواب
ہشت چیز نے او برد از ہشت مایہ ہشت چیز … سال و مہ ایں ہشت چیزش آہیں است اکتساب
حلم او سنگ زمین و طبع او لطف ہوا … وے او دیدار ماہ دوست او جود سحاب
رسم او حسن بہلہ و لفظ او قدر شکر … خلق او بازار مشک و خوے او بوئے گلاب
ہشت چیزش را برابر یا فتم با ہشت چیز … ہر یکے ثانی ہشت سوے فضل او در دار ماب
تیغ او را با قضا و تیر او را با شہاب … اسپ او را با سپہر و خشت او را با شہاب
حزم او را با امان و عزم او را با ظعز … لفظ او را با قرآن و حفظ او را با کتاب

(صنعت سوال و جواب)

بہ بخت کہ؟ گل سوری چہ ریختیت؟ برگ، چرا؟ … زہجر لالہ کجا رفت لالہ؟ شد پنہاں
ازاں چہ خیزد؟ دُر، و ازیں چہ خیزد؟ زر … سخا کہ در زد؟ ایں و عطا کہ بخشد؟ آں

## فردوسی

حسن بن اسحاق بن شرف نام، اور فردوسی[1] تخلص تھا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے، مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالہ سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے وطن میں بھی اختلاف ہے، چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژنام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا، دیباچہ شاہنامہ میں گاؤں کا نام شاداب لکھا ہے، بہر حال اس قدر عموماً مسلم ہے کہ فردوسی کا وطن طوس کے اضلاع میں تھا، اور یہ وہی مردم خیز خطہ ہے جس کی خاک نے امام غزالی اور محقق طوسی پیدا کئے۔

فردوسی کا وطن

سنہ ولادت معلوم نہیں البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے اور چونکہ عمر کم از کم ۸۰ برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد … امیدم بہ یکبارہ برباد شد

اسلئے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیئے۔

فردوسی کی ولادت

فردوسی جب پیدا ہوا تو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ نوزائیدہ بچے نے کوٹھے پر چڑھ کر نعرہ مارا،

---

[1] فردوسی کا حال تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہے، ان میں سب سے زیادہ قابل اعتبار چہار مقالہ ہے جس کا مصنف خود نامور شاعر اور فردوسی کے قریب العہد ہے، تاہم اس میں بھی سخت غلطیاں ہیں، تیمور کے پوتے بایسنغر کے فضلا سے شاہنامہ پر جو دیباچہ لکھوایا تھا۔ اس میں فردوسی کی مفصل سوانح عمری ہے لیکن بعض واقعات بقایا صفحہ ۶۲ پر

اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، صبح کو جاکر نجیب الدین سے جو اس زمانہ کے مشہور معبّر تھے، تعبیر پوچھی، انہوں نے کہا "یہ لڑکا شاعر ہوگا اور اس کی شاعری کا غلغلہ تمام عالم میں پھیلے گا، سن رشد کو پہنچکر تحصیل علوم میں مشغول ہوا اور تمام درسی علوم حاصل کئے، چونکہ آبائی پیشہ زمینداری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اس کی ملک میں تھا، اس لئے معاش کی طرف فارغ البال تھا وہ اطمینان کے ساتھ علمی مشغلوں میں بسر کرتا تھا۔ اور کتب بینی کیا کرتا تھا۔

شاہنامہ کی ابتدا اور دربار میں رسائی۔ یہ واقعہ جسقدر قطعی ہے اُسی قدر اُس کی تفصیل میں اختلاف ہے عام روایت یہ ہے کہ فردوسی دادرسی کے لئے محمود کے دربار میں گیا، یہاں اس کی شاعری کا جوہر کھلا۔ اور شاہنامہ کی تصنیف پر مامور ہوا، لیکن قطعاً غلط ہے، فردوسی نے خود بیان کیا ہے کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج ؛ بسے رنج بردم بہ امید گنج ؛ چو بر باد دادند گنج مرا ؛ نبُد حاصلے سی و پنج مرا

اور سلطان محمود کی کل مدت سلطنت ۳۱ برس ہے۔

شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے خود جو سبب تصنیف بیان کیا ہے اس سے بھی اس روایت کی تکذیب ہوتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے وہ شاہنامہ شروع کرچکا تھا تفصیل ان واقعات کی، شاہنامہ کے سبب تصنیف میں آگے آئے گی۔

بہرحال اس قدر یقینی ہے کہ فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتدا کی، اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اس کی سرپرستی کی، ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلاخاں مقرر ہوا چونکہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی، سلاخاں کے نام حکم پہنچا۔ کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو۔ فردوسی نے پہلے تو انکار کیا، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لئے راضی ہوگیا، اور طوس سے چل کر ہرات میں آیا۔ لیکن ادھر دراندازیاں شروع ہوگئیں، دربار کا میر منشی تاج الدین دبیر تھا، اسی نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی تصنیف کا خیال تھا، لیکن دربار کے شعراء میں سے کسی نے اس کی حامی نہیں بھری۔ اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعراء دربار کی آبرو خاک میں ملجائیگی عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جا

---

بقیہ صفحہ ۶۱ سے آگے۔ ایسے لغو لکھے ہیں کہ اعتبار اُٹھ جاتا ہے، دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں۔ عربی مصنفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے۔ میں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں، لیکن جا بجا ان کی غلطیوں کی بھی تصریح کر دی ہے۔

---

ﮯ یعنی برباد۔

سکتا کہ فردوسی کو اُلٹا پھیر دیجئے، لیکن اس کی اور تدبیر کرنی چاہیئے، چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا[۱] کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے سلطان کو یونہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا، اس لئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دی گئی تھی، فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا۔ لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا۔ کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی، عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا، اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجئے۔ عنصری نے جو لکھا خود غرضی سے لکھا تھا۔ فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں۔ یہ اشعار بھی خط میں درج کئے

بگوش از سروشم بسے مژدہ ہاست | دلم گنج گوہر زبان اژدہاست
چہ سنجد بہ میزانِ من عنصری | گیا چوں کشد پیش نگلیں سرے

غرض ہرات سے چل کر غزنیں میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی، شہر میں جن لوگوں سے راہ و رسم تھی اُن کو اپنے آنے کی اطلاع دی، چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا، حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور بادہ جام کا دور چل رہا تھا، فردوسی ادھر جا نکلا، حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا، ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آ کر چلا جائے گا، عنصری نے کہا، یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے، آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے سب اس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگائے، تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا۔

شعرا کا معرکہ

عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع چوں عارض تو ماہ نباشد روشن۔

فرخی نے کہا۔ مانند رخت گل نبود در گلشن۔

عسجدی نے کہا، مژگانت ہمے گزر کند از جوشن۔

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا، فردوسی نے برجستہ کہا ع مانند سنان گیو در جنگ پشن

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی، فردوسی نے تفصیل بیان کی، اُس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا، لیکن رشک اور حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہے، سب نے سازش کی

---

[۱] دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے، لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ میں مر چکا تھا

کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے۔[1]

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ مشاعرہ خود سلطان محمود کے دربار میں ہوا تھا، سلطان محمود کے ندیموں میں ماہک نام ایک شخص صاحب مذاق تھا، اُس سے یہیں باغ میں ملاقات ہوگئی تھی، فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھ کر گرویدہ ہوا اور اپنے گھر میں لاکر رکھا، کھانے کے بعد فردوسی سے کا حال دریافت کیا، اُس نے اپنی ساری داستان بیان کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری فرخی، زینی، عسجدی، مجنیک چنگ زن خرمی، ابوبکر، اسکاف ترمذی اس کام کیلئے انتخاب کئے گئے تھے ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف، اور شعرا کے انتخاب کا ذکر کیا، فردوسی نے کہا، مَیں بھی شعر کہتا ہوں، موقع ہو تو دربار میں میرا بھی ذکر کر دینا۔

ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف، اور شعرا کے انتخاب کا ذکر کیا، فردوسی نے کہا، میں بھی شعر کہتا ہوں، موقع ہو تو دربار میں جاکر فردوسی کی تقریب کرنی چاہی لیکن موقع نہ ملا، اس طرح ایک ہفتہ گذر گیا، ایک دن ماہک نے دربار سے آکر بیان کیا کہ آج تمام شعرا دربار میں حاضر تھے اور شاہنامہ کی مختلف داستانیں سنائی جارہی تھیں، عنصری نے رستم وسہراب کی داستان نظم کی تھی، جب یہ دو شعر پڑھے۔

| | |
|---|---|
| ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخون | بیالودی ایں خنجر آب گون |
| زمانہ بخونِ تو تشنہ شود | بر اندام تو موے دشنہ شود |

تو سلطان محمود نے نہایت پسند کیا اور حکم دیا کہ عنصری ہی اس خدمت کے لئے مقرر کیا جائے فردوسی اس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی، رات کو حسب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعرا نے رستم وسہراب کی داستان نظم کی ہے۔ چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں، یہ کہہ کر نظم حوالہ کی، سرنامہ تھا۔

| | |
|---|---|
| کنوں خورد باید مئے خوشگوار | کہ مے بوے مشک آرد از جویبار |
| ہوا پُر خروش و زمیں پُر ز جوش | خنک آنکہ دل شاد دارد بہ نوش |
| ہمہ بوستاں زیر برگ گل است | ہمہ کوہ پُر لالہ و سنبل است |

---

[1] یہ دیباچہ شاہنامہ کی روایت ہے دولت شاہ کا بیان ہے اس امتحان کے بعد عنصری نے فردوسی کی تحسین کی اور خود دربار شاہی میں اسکو لیجا کر پیش کیا۔

ماہک نے سلطان محمود کی خدمت میں جاکر تمہید کے ساتھ پیش کی محمود نے پوچھا کہ یہ جواہر کہاں سے ہاتھ آئے۔ ماہک نے فردوسی کا نام لیا، اُسی وقت طلبی ہوئی، محمود نے نام و نشان پوچھا، فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے، اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے اور کس نے آباد کیا، فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے۔ محمود نے شعرائے سبعہ کو بلوایا اور فردوسی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ رستم و سہراب کی داستان اسی نے نظم کی ہے۔ فردوسی نے اس کے اشعار سُنائے تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ محمود نے خلعت عطا کیا، شعرائے تحسین کی صدا بلند کی، عنصری نے بڑھ کر فردوسی کے ہاتھ چوم لئے، اس زمانہ میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سبزہ خط کی تعریف میں کچھ کہے، فردوسی نے برجستہ کہا۔

مست است بتا! چشم تو و تیر بدست | بس کس کہ زتیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ، عذرش ہست | کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

بدیہہ گوئی کا امتحان

یعنی معشوق کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں، اُن تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں۔ اس لئے ان سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے (خط زرہ سے تشبیہ دی ہے) کیونکہ مست سے سبھی ڈرتے ہیں، خصوصاً جب اس کے ہاتھوں میں تیر ہو۔

شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی

محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو، اور آلات جنگ، اسلحۂ حرب، شاہان عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کے موقعوں اور تصویروں سے سجا دیا جائے، ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں، لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا، اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائیگی تو ایک ساتھ لوں گا۔

فردوسی جب وطن میں تھا۔ تو اکثر ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا کرتا، اور آب رواں کی سیر سے لطف اُٹھاتا، چشمہ کے اُوپر بند تھا جو برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا۔ اور اس وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا تھا، فردوسی کی طبیعت اس سے مکدر ہوئی تھی، قصد کیا کہ بند کو پختہ کرادے، لیکن اتنا مقدور نہ تھا، شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو نیت کی کہ جو کچھ صلہ ملے گا بند کی تیاری میں صرف کروں گا، یہ وجہ تھی، کہ اس نے شاہنامہ کا صلہ متفرق طور پر لینا پسند کیا۔

فردوسی نے متصل چار سال تک غزنین میں قیام کیا، اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا، پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا، اس اثنا میں جو حصہ طیار ہو چکا تھا، محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کئے۔

شاہنامہ کی تصنیف کے بیسویں سال جبکہ اس کی عمر ۶۵ برس کی تھی، اس کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا، فردوسی کو سخت رنج ہوا، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شہنامہ میں کیا ہے۔

اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال

مگر بہرہ گیرم از پند خویش — براندیشم از مرگ فرزند خویش
زبدہا تو بودی مرا دستگیر — چرا راہ جستی ز ہمراہ پیر
مگر ہمرہان جوان یافتی — کہ از پیش من تیز بشتافتی
جوان را چو شد سال برسی و ہفت — نہ برآرزو یافت گیتی و رفت
ہمے بود ہموارہ با من درشت — برآشفت و یکبارہ بنمود پشت
مرا شصت و پنج و ورا سی و ہفت — نپرسید ازین پیر و تنہا برفت

علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی یعنی جب شاہنامہ تیار ہوا تو اسکو اشرفیوں کے بجائے روپے دلوائے گئے۔

فردوسی کی ناکامی اور اس کا سبب

یہ واقعہ عموماً مسلّم ہے، لیکن اسباب مختلف بیان کئے گئے ہیں اور سب باہم متناقض ہیں دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا، اس لئے[1] اُس نے دراندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا، اور چونکہ فردوسی کا مرّبی اور سرپرست وہی تھا، اس لئے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف و جوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے. فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتا تھا حسن کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا، لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا، اور کہتا تھا،

من بندہ کہ مبادی فطرت نبودہ ام — مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوے دو وزیر چرا التفت شوم — چوں فارغم ز بار گہ پادشاہ نیز

---

[1] دولت شاہ

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ، اس لیے بھی اس نے فردوسی کی مخالفت کی، ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے[1]

دیباچہ نویسوں نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے اور اس پر ان کو ناز ہے، وہ یہ کہ فردوسی نے شاہنامہ میں جابجا شرافتِ نسب کو بڑی آب و تاب سے لکھا ہے۔ اور یہ سلطان محمود کو اس وجہ سے ناگوار ہوتا تھا۔ کہ وہ غلام زادہ تھا، اس لئے شرافت کی خوبی پر زور دینا گویا در پردہ اس پر چوٹ تھی۔

تذکرہ نویسوں کا فیصلہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کے شیعہ پن کی وجہ سے اس کی قدر دانی میں کمی کی، لیکن اولاً تو محمود کے دربار میں بہت سے شیعی علماء و فضلا تھے جو نہایت قدر و عزت سے بسر کرتے تھے، ابوریحان بیرونی جو علانیہ شیعہ تھا محمود نے خود فرمان بھیجکر اُس کو بلایا تھا اور نہایت قدردانی کرتا تھا، دربار میں ہندو، عیسائی، یہودی، ہر مذہب و ملت کے اہل کمال تھے، فردوسی نے کیا قصور کیا تھا،

دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے، اور وہ قرین قیاس ہے،

سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی، جس کی وجہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے اور دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا۔ اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا، وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا، جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائیگا، یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی، محمود نے سُنا تو اس کو ناگوار گذرا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلاطینِ دیلم عموماً سخت شیعہ تھے۔ ۳۵۱ھ میں معزالدولہ

---

[1] سلطان محمود کی مدت حکومت میں تین شخصوں کو وزارت کا رتبہ ملا، سب سے پہلے فضل بن احمد اس منصب پر ممتاز ہوا، وہ ابتدا میں سامانی خاندان کا نائب میر منشی تھا، پھر سبکتگین کے دربار میں وزارت کے رتبہ پر پہنچا، سبکتگین کے بعد سلطان محمود نے اس کا عہدہ بحال رکھا، علم و فن سے عاری تھا، لیکن مہمات سلطنت کے انتظام میں خداداد ملکہ رکھتا تھا، دس برس وزارت کرنے کے بعد سلطان محمود نے قرابت کی بنا پر معزول کر دیا، اس کے بعد حسن میمندی وزیر مقرر ہوا، اٹھارہ سال کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور حسن بن محمد کو وزارت[2] کی سند ملی، فردوسی نے فضل بن احمد کی مداح شاہنامہ میں لکھی ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد کے دربار میں اس نے فردوسی کی تقریب کی ہوگی، اور بالآخر جس نے محمود کو فردوسی کی ناکامی پر متوجہ کیا، وہ حسن بن محمد ہوگا،

[2] حبیب السیر میں ان وزراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں،

دیلمی کے حکم سے بغداد کی تمام مسجد کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی گئی "امیر معاویہ اور غاصب فدک پر لعنت ہے" رات کو لوگوں نے یہ عبارت مٹادی معزالدولہ نے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا، لیکن وزیر مہلبی نے رائے دی کہ صرف اس قدر لکھوا دیا جائے "ظالمین آل محمد پر لعنت ہے" البتہ معاویہ کا نام بہ تصریح لکھا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی [1] یہ تعصب روز بروز بڑھتا گیا سیوطی ۳۶۳ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں

| | |
|---|---|
| وفی ھذہ السنۃ وبعدھا غلا | اس سنہ میں اور اس کے بعد مصر، شام |
| الرفض وفار بمصر والشام والمغرب | اور مشرق و مغرب میں رفض ابل پڑا، |

(تاریخ الخلفاء)

فرقۂ باطنیہ جو مسلمانوں کو چھپ چھپ کر قتل کرتا رہتا تھا اُن کی بڑی جمعیت دیلمیوں ہی کے زیر حمایت تھی، چنانچہ جب ۴۲۰ھ میں سلطان محمود نے مجدالدولہ دیلمی کو گرفتار کیا تو باطنیوں کا ایک گروہ عظیم اس کے ساتھ تھا، ان اسباب سے محمود کو دیلمیوں کے ساتھ نہ صرف مذہبی بلکہ پولیٹیکل دشمنی بھی تھی، اس لئے وہ فردوسی کے ساتھ فخرالدولہ دیلمی کی خط و کتابت کو مصالح ملکی کے لحاظ سے بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا،

بہر حال وجہ کچھ ہو، واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہ کیا، فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہنچا، فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں، فردوسی کے دل سے بیساختہ آہ نکلی، تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں، اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ "میں نے یہ خون جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا، ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی، محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی، اور کہا کہ تیری درانداذی نے مجھ کو بدنام کر دیا، میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا، انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے، اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں بھی اثر کیا، اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا، فردوسی کو خبر ہوئی۔ تو سخت پریشان ہوا، صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے؛

| | |
|---|---|
| چو در ملک سلطاں کہ چرخش ستود | بے ہست ترسا و گبرو یہود |
| گرفتند در ظل عدلش قرار | شدہ ایمن از گردش روزگار |
| چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ | رہے راشمارد یکے زاں گروہ |

سلطان محمود کو رحم آیا، اور اس کی تقصیر معاف کی،

سلطان محمود کی ہجو

غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سر بمہر دیا اور کہا کہ میرے سلطان محمود جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

---

[1] ابن الاثیر واقعات ۳۵۱ھ

یکے بندگی کردم اے شہریار | کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
پے افگندم از نظم کاخ بلند | کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی | عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنج مرا | نبُد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر | بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادرِ شاہ بانو بُدے | مرا سیم و زر تا بزانو بُدے
پرستار زادہ نیاید بکار | وگر چند دارد پدر شہریار
سرِ ناسزایاں برافراشتن | وزیشاں اُمیدِ بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن است | بہ جیب اندروں مار پروردن است
درختے کہ تلخ است ویرا سرشت | گرش بر نشانی بہ باغ بہشت
ور از جوی خلدش بہ ہنگام آب | بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد
ز بد اصل چشمِ بہی داشتن | بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفتم ایں بیتہائے بلند | کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں، ملک کے ملک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا، لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے،

فردوسی کا غزنین سے نکل کر آوارہ پھرنا

فردوسی غزنین سے نکلا تو اس بے سر و سامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا کچھ پاس نہ تھا، احباب اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی لیکن معتوبِ شاہی کو کون پناہ دے سکتا تھا، تاہم ایاز نے یہ جرأت کی کہ جب فردوسی شہر سے باہر نکل گیا تو مخفی طور پر کچھ نقدی اور سامانِ سفر بھجوا دیا، فردوسی ہرات میں آیا اور اسمٰعیل وراق کے ہاں مہمان ہوا، چونکہ سلطان محمود ہر طرف فرمان بھیج دیئے تھے کہ فردوسی جہاں ہاتھ آئے گرفتار کر کے بھیج دیا جائے چھ مہینے تک روپوش رہا، شاہی جاسوس ہرات میں آئے، لیکن فردوسی کا پتہ نہ لگا سکے، اب اس نے ہرات سے طوس کا رخ کیا، طوس سے قہستان گیا، ناصر لک یہاں کا حاکم تھا، اس کو خبر ہوئی تو ندمانِ خاص ہی کو استقبال کے لئے

بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا۔ فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جس میں حاسدوں کی دراندازی، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا۔

سلطان محمود کی شکایت کے اشعار

به غزنین مرا گرچه خون شد جگر | ز بیداد آں شاہ بے داد گر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام | شنید از زمین آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغانہا کنم | بہ گیتی از و داستانہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش | نہ ترسم بغیر از خداوند عرش
چو دشمن نمیداند از دوست باز | بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودہ محتشم | ندانم کزیں بیش چوں سر کشم
فرستادم از گفتہ داشتم | بہ نزدیک خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا ناصواب | بسوزاں در آتش بشو آں در آب
گذشتم ایا سرور نیک رائے | ازیں داوری تا بدیگر سرائے
رسد لطف یزداں بفریاد من | ستاند بہ محشر از و داد من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصر لک کو سنائے تو اس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہل کمال کی شان نہیں ہے، لاکھ روپیے ان اشعار کے معاوضہ میں دیتا ہوں، اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا، ناصر لک نے سلطان محمود کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا[1]۔

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا[2] تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا،

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست | چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
چو غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر | گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

اتفاق یہ کہ جس دن ناصر لک کا عریضہ پہنچا، سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آیا تھا، اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی، نہایت متاسف ہوا، مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا، جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُن کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا،

---

[1] چہار مقالہ | [2] یہ دیباچہ کی روایت ہے، چہار مقالہ میں قہستان کے بجائے طبرستان اور ناصر لک کے بجائے سپہبد شیر زاد کا نام ہے، دولت شاہ نے طبرستان کے بجائے رستمدار لکھا ہے، طبرستان اور رستمدار در اصل ایک ہی ہیں لیکن سپہبد اور ناصر لک دو شخص ہیں، دولت شاہ نے ان میں سے ایک کو چھوڑ دیا ہے +

ناصر لک نے گو فردوسی کی بہت کچھ خاطر مدارات کی، تاہم سلطان محمود کے ڈر سے اپنے پاس نہ ٹھہرا سکا، فردوسی یہاں سے بھی نکلا اور ماژندران میں آیا۔ یہاں وہ شاہنامہ کی نظر ثانی میں مشغول ہوا، ماژندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرماں روا تھا، اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرّت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بُلایا فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا، سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے، لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا، ایک گراں بہا صلہ بھیج کر محمود آپ سے ناراض ہے اس لئے میں آپ کو ٹھہرا نہیں سکتا، اور کہیں تشریف لے جائیے،

دیباچہ نویسیوں نے لکھا ہے کہ " فردوسی یہاں سے بغداد گیا، خلیفہ عباسی نے اس کی بڑی قدر کی، فردوسی نے عربی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے اور اہل بغداد کی فرمایش سے یوسف زلیخا لکھی سلطان محمود کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو خلیفہ عباسی کو تہدید کا خط لکھا، کہ فردوسی کو فوراً یہاں بھیج دیجے، ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا، وہاں سے تین حرف الف لام میم لکھ کر آئے کہ سورۂ الم ترکیف کی طرف اشارہ تھا، لیکن تمام بے سروپا خرافات ہیں،

ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آرہا تھا، راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا، وہیں ٹھہر گیا، اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجا لائے، دوسرے دن قاصد جواب لایا، لیکن ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے، وزیر نے برجستہ کہا،

اگر جز بکام من آمد جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان محمود نے طرفات کا دورہ کیا۔

محمود پھڑک اُٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا اُس بدقسمت کا جس نے ۱۵ برس خونِ جگر پیا اور کچھ نہ حاصل ہوا[1]، محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے، غزنین پہنچکر یاد دلانا، غرض پایہ تخت میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں، لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے، ادھر شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا، اُدھر دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا ؎

---

[1] یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہے، میں نے جو روایت لکھی ہے، نظامی سمرقندی سے مروی ہے۔ اور اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ اس نے ۵۱۴ھ میں امیر معزی ملک الشعراء سلطان سنجر سے سُنی تھی اور امیر معزی سے امیر عبدالرزاق نے بیان کی تھی، (دیکھو چار مقالہ واقعات فردوسی)

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ　　　یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

طوس میں ایک واعظ صاحب تھے انہوں نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فردوسی رافضی تھا، اس کا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا، ہر چند لوگوں نے منت سماجت کی، لیکن بدنفس واعظ نے ایک نہ مانی، مجبوراً شہر کے باہر، ایک باغ میں کہ فردوسی کے ملک تھا، دفن کیا، سلطان محمود کو پرچہ گذرا تو حکم دیا کہ واعظ شہر سے نکال دیا جائے[1]۔

فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی، صرف ایک لڑکی تھی، شاہی صلہ اس کی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن اس کی بلند ہمتی نے گوارا نہ کیا کہ باپ جس چیز کی حسرت میں مر گیا اولاد اس سے تمتع اٹھائے، سلطان محمود کو اس کی اطلاع دی گئی، حکم دیا کہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحٰق کے حوالہ کیجائیں کہ اس سے فردوسی کے نام پر ایک کارروان سرائے بنا دی جائے، ناصر خسرو نے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ۴۳۰ھ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی، لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے، فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہے، کہ اس کا نام چاہ ہے، اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہے،

عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فردوسی نے ۴۱۱ھ میں وفات پائی، لیکن فردوسی نے شاہنامہ کے خاتمہ میں تصریح کی ہے، کہ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں انجام کو پہنچا؀

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار　　　کہ گفتم من این نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ اس وقت اس کی عمر ۸۰ برس کی تھی،

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد　　　امیدم بیکبارہ بر باد شد

شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد، وہ دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں رہا، اس لئے اس کی وفات ۴۱۱ھ سے چند برس پہلے ہوئی ہوگی،

فردوسی کا مزار مدت آباد اور بوسہ گاہ عالم رہا، نظامی سمرقندی نے ۵۱۰ھ میں اس کی زیارت کی تھی، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ آج اس کا مزار مرجع عام ہے، قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں لکھتے ہیں کہ عبد اللہ خان ازبک کی توجہ سے فردوسی کا مقبرہ معمور اور پُر رونق ہے، عام لوگ عموماً اور شیعہ خصوصاً زیارت کو جاتے ہیں، میں نے بھی زیارت کا شرف حاصل کیا؀

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

---

[1] پانچ کو اسّی میں ضرب دیں تو چار سو ہوتے ہیں۔

# شاہنامہ

**سنہ تصنیف**
**سببِ تصنیف**

کیا عجیب بات ہے، جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچکر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا، اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے:

فردوسی نے خاتمہ میں خود تصریح کی ہے کہ یہ کتاب سنہ ۴۰۰ھ میں تمام ہوئی۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار[1] — کہ گفتم من این نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ پینتیس برس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج — بسے رنج بردم بامید گنج

اس بنا پر تصنیف کا آغاز سنہ ۳۶۵ھ سمجھنا چاہئے، اور چونکہ سلطان محمود سنہ ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوا، اس لئے اس کی تخت نشینی سے مدتوں پہلے شاہنامہ کی ابتدا ہو چکی تھی۔

عام خیال یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمایش سے لکھا گیا، لیکن یہ بھی محض غلط ہے، فردوسی نے خود سببِ تالیف لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو صرف اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا مقصود تھا،

ہمی خواہم از دادگر یک خدای — کہ چندان بمانم بہ گیتی بجای
کہ این نامۂ شہریاران پیش — بپیوندم از خوب گفتار خویش
بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدین پارسی
ہمہ مردہ از روزگار دراز — شد از گفت من نامشان زندہ باز
چو عیسی من این مردگان را تمام — سراسر ہمہ زندہ کردم بنام
پے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باران نیابد گزند

تیسرے دفتر میں جہاں دقیقی کے اشعار نقل کئے ہیں، خاتمہ پر لکھتا ہے:

من این نامہ فرخ گرفتم بفال — ہمی رنج بردم بہ بسیار سال
ندیدم سرافراز بخشندۂ — بگاہ کیان بر نشستندۂ
سخن را نگہداشتم سال بیست — بدان تا سزاوار این گنج کیست

[1] کتاب الفہرست ص ۱۱۵

جہاں دار محمود با فرّ و جود | کہ اورا کند ماہ و کیواں سجود
--- | ---

ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں پہنچنے سے بیس سال پہلے شاہنامہ شروع ہو چکا تھا۔

دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آغاز کتاب اس نے خود اپنے شوق سے کیا قرائن سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، فردوسی فطرۃً شاعر تھا، اس کے ساتھ نسل کا مجوسی یعنی شاہان ایران کا ہم قوم تھا، دقیقی نے شاہنامہ کی جو بنیاد ڈالی تھی اور جسقدر شعر لکھ لئے تھے، اس کے چرچے ہر جگہ پھیل گئے تھے اور اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کتاب میں قبولیت کا کس قدر مادہ ہے، یہ اسباب اس بات کے لئے کافی تھے کہ فردوسی نے خود اپنے شوق سے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن چونکہ ایک عظیم الشان کام تھا، اور اعانت کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا، سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ کا مستند سرمایہ ہاتھ آئے، حسن اتفاق یہ کہ فردوسی کے وطن ہی میں ایک شخص کے پاس یہ سرمایہ موجود تھا، اور وہ فردوسی کا مخلص دوست تھا، اس کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یہ کتاب لاکر فردوسی کو دی، چنانچہ فردوسی دیباچہ میں لکھتا ہے،

| | |
| --- | --- |
| بہ شہرم یکے مہرباں دوست بود | تو گفتی کہ با من بیک پوست بود |
| مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو | بہ نیکی خرامد مگر پائے تو |
| نوشتہ من ایں نامۂ پہلوی | بہ پیش تو آرم مگر نغنوی |
| شو، ایں نامۂ خسرواں باز گوے | بدیں جوے نزد مہاں آبروے |
| چو آورد ایں نامہ نزدیک من | برافروخت ایں جان تاریک من |

فردوسی اگرچہ جیسا کہ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے "رئیس زادہ اور خوش حال تھا تاہم جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو علم دوست امراء نے قدردانی کا اظہار کرنا چاہا، لیکن منصور بن محمد نے جو طوس کا حاکم تھا ایسی فیاضی کا اظہار کیا، کہ فردوسی تمام لوگوں سے بے نیاز ہو گیا،

| | |
| --- | --- |
| بدیں نامہ چوں دست کردم دراز | یکے مہترے بود گردن فراز |
| جواں بود از گوہر پہلواں | خردمند و بیدار روشن رواں |
| مرا گفت کز من چہ آید ہمے | کہ جانت سخن بر گراید ہمے |
| بچیزے کہ باشد مرا دسترس | بکوشم نیازت نہ آرم بکس |

شاہنامہ کے قدردان

افسوس کہ منصور چند روز کے بعد مر گیا، فردوسی نے اس کا بہت پُرزور مرثیہ لکھا، حسین قتیب، علی دیلم، بودلف، اور فضل بن احمد کا نام بھی فردوسی کے قدر دانوں کی فہرست میں داخل ہے، نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "حسین قتیب طوس کا عامل تھا" غالباً منصور کے مرنے کے بعد مقرر ہوا ہوگا، اس نے فردوسی کے دیہات کی مالگذاری معاف کر دی تھی[۱]،

فضل بن احمد سلطان محمود کا وزیر تھا، جس کے مرنے کے بعد حسن میمندی اس منصب پر ممتاز ہوا، فضل کا تذکرہ بھی فردوسی نے شاہنامہ میں کیا ہے،

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا، اور بودلف راوی تھا، یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا، اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا، لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ فردوسی کے سرپرست اور مربّی تھے، کاتب اور راوی نہ تھے،

علی دیلم و بودلف راست بہر ۔۔۔ ازاں نامور نامداران شہر

بودلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ بودلف ہے جو ایک محتشم رئیس تھا، جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ لکھا ہے، اور دیباچہ میں اسکی مدح و ثنا کی ہے

جہاندار ماز اٰلِ پاک دین ۔۔۔ ملک بودلف شہریار زمین

زنسل براہیم پیغمبر است ۔۔۔ بزرگی کہ با آسماں ہمسر است

خوش اعتقاد دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے، کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شیخ محمد معشوق طوسی کی خدمت میں جو ایک مشہور صاحبدل تھے، حاضر ہوا، اور ان سے اپنا خیال ظاہر کیا، انھوں نے کہا تم اس کام کو شروع کرو، خدا تم کو کامیاب کرے گا، فردوسی تو کامیاب نہیں ہوا، لیکن شاہنامہ کی کامیابی میں کس کو شک ہو سکتا ہے،

## شاہنامہ کا ماخذ

شاہنامہ کا تاریخی مواد

سر جان مالکم صاحب[۲] اپنی تاریخ صفحہ ۶۵ میں لکھتے ہیں،

---

[۱] چہار مقالہ، نظامی سمرقندی،

[۲] سر جان مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں انگریزی سرکار کی طرف سفیر تھے انھوں نے ایران کی تاریخ قدیم و جدید پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی، مرزا حیرت ایرانی نے اس کا ترجمہ کیا۔ جو بمبئی میں چھاپا گیا +

"قرنِ اوّل کے تمام مورخین لکھتے ہیں کہ چونکہ ایرانیوں نے عرب کے حملے کے روکنے میں نہایت پامردی دکھائی تھی، اس لئے پیروانِ اسلام اس قدر برافروختہ تھے کہ انہوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کردیا، شہروں کو آگ لگادی، کہ انہوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کردیا، شہروں کو آگ لگادی، کتب خانوں کے مالکوں کو قتل کرادیا، ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کردیں، کتب خانوں کے مالکوں کو قتل کرادیا، ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کردیں، کتب خانوں کے مالکوں کو قتل کرادیا، یہ متعصب عرب قرآن کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے، موبدوں کو مجوس کہتے تھے اور ان کو جادوگر سمجھتے تھے، یونان اور روم کی کتابوں سے قیاس ہوسکتا ہے۔ کہ اس طوفان میں ایران کی کس قدر کتابیں بچی ہوں گی، تقریباً چار سو برس گذر گئے اور کسی نے ایرانیوں کی تاریخ لکھنے پر توجہ نہیں کی، سب سے پہلی کوشش اس کے متعلق جو کی گئی وہ سامانیوں نے کی، مورخین کو اس میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ منصور ثانی نے ابتدا کی، بعض کہتے ہیں کہ دقیقی نے شاہنامہ لکھنا اسمٰعیل کے زمانہ میں شروع کیا جو سلسلہ سامانیہ کا پہلا تاجدار تھا، غرض چونکہ سلاطین سامانی اپنے آپ کو بہرام چوبین کے خاندان سے سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا چاہا"

مالکم صاحب کی متعصبانہ رائے

مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں رہتے ہیں، فارسی زبان میں ان کو پوری مہارت تھی، اسلامی تاریخ کی طرف خاص توجہ تھی، ان سب باتوں کے ساتھ ان کی تحقیقات کا یہ عالم ہے کہ اتنی لمبی چوڑی عبارت میں ایک حرف بھی صحیح زبان سے نہ نکلا!

مالکم صاحب کے تعصّب کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے یہ امر قابلِ بحث ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا چاہا تو ایران کا تاریخی ذخیرہ کس قدر موجود تھا، عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین سنہ ۱۴۳ھ سے شروع ہوئی اور درحقیقت اسلامی علوم و فنون کے متعلق اس سے پہلے کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ غیر قوموں کے علوم و فنون کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہوچکا تھا، ہشام بن عبدالملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور جو سلاطین بنی امیہ کا گل سر سبد تھا، سب سے پہلے اس نے غیر قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ کی، اس کا میر منشی جبلہ بن سالم تھا۔ اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، جن میں سے جنگ رستم و اسفندیار اور داستان بہرام چوبین بھی تھی،[۱] شاہانِ عجم کے علمی ذخیرے جو فتوحات میں ہاتھ آئے تھے۔ ان میں ایک کتاب تاریخ تھی۔ یہ

ایران کی قدیم تاریخیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں

یہ ایران کی نہایت مفصل اور مبسوط تاریخ تھی، جس میں سلطنتوں کے حالات کے ساتھ حکومت کے قواعد اور آئین، عہد بعہد کے علوم و فنون، تعمیرات وغیرہ کے مفصل حالات تھے ایک خاص جدت یہ تھی کہ تمام سلاطین کی تصویریں بھی تھیں اور تصویروں میں ان کی خاص وضع قطع، لباس، زیورات اور اور تمام خصوصیات کو بعینہٖ دکھایا تھا، ہشام نے اس کتاب کا ترجمہ کرایا، چنانچہ ۱۱۳؁ھ میں یہ ترجمہ تیار ہوا، مورخ مسعودی نے کتاب الاشراف[۱] میں لکھا ہے کہ میں نے ۳۰۳؁ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب دیکھی، سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں فارسی میں موجود ہیں یہ سب سے زیادہ مفصل ہے، دولت عباسیہ نے آغاز ہی سے ایران کے علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، ان میں سے تاریخی کتابیں حسب ذیل ہیں:-

خدائی نامہ[۱] یہ نہایت مفصل تاریخ تھی اور اس قدر مقبول عام تھی کہ بہرام بن مروان شاہ نے جو دولت عباسیہ کا مترجم تھا، جب اس کتاب کو بہم پہنچانا چاہا تو بیس مختلف نسخے اس کو ہاتھ آئے، عبد اللہ بن المقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا،

آئین نامہ، یہ بھی نہایت مفصل کتاب ہے علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (ص ۱۰۴ میں)، لکھا ہے، کہ یہ بہت ضخیم کتاب اور کئی ہزار صفحوں میں ہے، عبد اللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

| | |
|---|---|
| سیر ملوک الفرس | مترجمۂ عبد اللہ بن مقفع، |
| سیر ملوک الفرس | مترجمۂ محمد جہم البرمکی |
| سیر ملوک الفرس | مترجمہ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی |
| سیر ملوک الفرس | مترجمہ محمد بن بہرام الاصفہانی، |

سکیسراں، پہلوی زبان میں تھی، مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم اس کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے، عبد اللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

| | |
|---|---|
| تاریخ دولت ساسانی | مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی اصلاح[۳] دادہ بہرام بن دان شاہ موبد نیشاپور، |

---

[۱] خدائی نامہ کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی مطبوعہ یورپ ص ۱۶۔۲۰۔۲۴ اور کتاب الفہرست ص ۱۱۸ میں ہے۔

[۲] ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۹ میں ہے [۳] ان دونوں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۱۰ میں ہے۔

کارنامہ نوشیرواں

شہرزادو پرویز

کارنامہ اردوشیر بن بابک — اردشیر نے اپنے حالات اور واقعات خود لکھے تھے[1]۔

کتاب التاج

بہرام ونرسی نامہ

کارنامہ — نوشیرواں کے حالات،

مزوک نامہ

ان کتابوں کے علاوہ سلاطین ایران کے عہد نامے، توقیعات اور فرامین مہیا کئے گئے اور ان کا ترجمہ کیا گیا، مثلاً وصیت نامۂ نوشیرواں بنام ہرمز، عہد نامہ آردوشیر بابکاں بنام شاپور، کسریٰ و مرزبان کا مکالمہ، نوشیرواں کا خط سرداران فوج کے نام، نوشیرواں اور جواسپ کے مراسلات[2]

جب تاریخ ایران کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا تو مورخین اسلام نے ان کی مدد سے خود مستقل تصنیفیں کیں، چنانچہ محدث طبری، علامۂ مسعودی، ابوحنیفہ دنیوی، لیعقوبی، حمزہ اصفہانی وغیرہ نے ایران کی مبسوط اور مفصل تاریخیں لکھیں جو یورپ کی بدولت آج چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یہ تمام کتابیں فردوسی کے زمانہ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں، ان واقعات کے بعد مالکم صاحب کی رائے کو پڑھو کہ "مسلمان چارسو برس تک ایران کی تاریخ سے ناواقف تھے اور سب سے پہلی کوشش سامانیوں کے دور میں ہوئی"

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، فارسی میں اس وقت تک ترجمہ کے سوا کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی تھی، غالباً سب سے پہلی کتاب جو تاریخ ایران پر لکھی گئی وہ ابو علی محمد بن احمد البلخی کی تصنیف تھی جس کا نام اس نے شاہنامہ رکھا تھا، اسی بنا پر کشف الظنون میں اس کو شاہنامہ قدیم لکھا ہے۔

ابوریحان بیرونی نے آثار الباقیہ[1] میں لکھا ہے کہ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ میں

---

[1] مروج الذہب مسعودی مطبوعہ یورپ صـ ۱۶۲، جلد اوّل،

[2] ان چاروں کتابوں کا ذکر فہرست بن الندیم صـ ۳۱۵ میں ہے،

[1] دیکھو کتاب مذکور مطبوعۂ یورپ صـ ۹۹،

نے اس کتاب کا سرمایہ کُتب مندرجہ ذیل سے فراہم کیا، سیر الملوک عبد اللہ ابن المقفع، سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی، سیر الملوک ہشام بن القاسم، سیر الملوک بہرام شاہ بن مردان شاہ، سیر الملوک بہرام اصفہانی، تصانیف بہرام مجوسی،

غرض دقیقی نے شاہ نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ عجم کا بہت بڑا ذخیرہ عربی و فارسی میں تیار ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانیوں کی فرمایش سے یہ کام شروع کیا تھا، سامانیوں کا کتب خانہ اس زمانہ میں تمام عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شیخ بو علی سینا جب اوّل اوّل اس کُتب خانہ میں داخل ہوا تو اس پر حیرت چھاگئی چنانچہ اُس نے اقرار کیا کہ میں نے اتنا نادر اور عظیم الشان کتبخانہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا" دقیقی کے لئے یہ تمام تاریخی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہوگا، اور چونکہ سلطان محمود غزنوی سامانیوں ہی کا دست پرور اور ان کو مٹا کر ان کا جانشین بنا تھا، اس لئے ہر طرح قرین قیاس ہے کہ وہ سب سامان محمود کو ہاتھ آیا ہوگا۔ اور فردوسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہوگا، یہ محض قیاس نہیں بلکہ مورخین کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے کشف الظنون میں ہے،

تاریخ الفرس لبعض قدماء اهل فارس وقد کان معظما عند العجم لما فیه من اخبار اسلافهم ملوکهم وهو اهل الشهنامه وغیرها ونقله ابن المقفع من الفهلویة الی العربیة

تاریخ ایران بعض قدماے ایران کی تصنیف ہے عجمی اس کتاب کی اس لئے بہت عزت کرتے تھے کہ اس میں ان کے آباو اجداد اور سلاطین کے حالات تھے اور یہی کتاب شاہنامہ وغیرہ کا ماخذ ہے ابن المقفع نے اس کو پہلوی زبان سے ترجمہ کیا

تھا، یہ وہی خدائی نامہ ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا،

صاحب مجمع الفصحاء لکھتے ہیں،

"از جملہ نامہائے قدیم جاسپ نہاد، کتاب است کہ در ذکر خسروان ایران بودہ دیگر آئین بہمن است، در احوال بہمن، دیگر داراب نامہ است، دیگر دانش افزاے نوشیروانی کہ جامع آں بزرگ مہر حکیم بودہ، و باستان نامہ و دانشور نامہ و خرد نامہ و حکیم ابوالقاسم محمد بن منصور فردوسی آثار افعال ملوک عجم را ازاں نامہا بدست آوردہ"

ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں، لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرے گی

فردوسی کا دعوے ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب و مدون نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزاء تھے، ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرانے موبد جمع کئے اور ان پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دیکر ایک مکمل کتاب تیار کرائی،

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق خود فردوسی کا بیان

یکے نامہ بُد از گہ باستاں — فراواں بدو اندروں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے — ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد — دلیر و بزرگ و خردمند و راد
ز ہر کشورے موبدے سالخورد — بیاورد ویں نامہ را گرد کرد
بپرسید شاں از نژاد کیاں — وزاں نامداران فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک مہاں — سخنہائے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیشاں سپہبد سخن — یکے نامور نامہ افگند بن

فردوسی کا بیان ہے کہ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن چونکہ ناتمام چھوڑ گیا میں نے اس کی تکمیل کی،

فردوسی کے بیان کے مطابق شاہنامہ کی اصلی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی گئی، لیکن جستہ جستہ داستانیں اور ذریعوں سے فراہم ہوئیں، رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے، تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام و نریمان کی اولاد سے تھا، اس کے پاس سلاطین ایران کی تاریخ تھی، اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں، شغاد کا قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا:

یکے پیر بُد نامش آزاد سرو — کہ با احمد سہل بودے بہ مرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے — تن و پیکر پہلواں داشتے
بہ سام نریماں کشیدش نژاد — بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن انچہ زو یافتم — سخن را یک اندر دگر بافتم

فردوسی کا دعوے ہے ہم کو انکار کی کوئی وجہ نہیں، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ فردوسی نے خود تیسری جلد میں دقیقی کے اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے،

یکے نامہ دیدم پُر از داستاں — سخنہائے آں پُر منش راستاں

فسانہ کہن بود منثور بود　　طبائع ز پیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیان دو ہزار　　گرایدون کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگوئیندہ بر آفرین　　کہ پیوند را راہ داد اندریں

تیسرے شعر میں صاف تصریح ہے کہ کتاب مذکور دو ہزار برس کی تصنیف تھی، یہ ظاہر ہے کہ کہ دو ہزار برس پہلے ایران کی جو زبان تھی وہ فردوسی کے زمانہ کی زبان نہ تھی بلکہ ژند یا اس کے قریب ہوگی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہے، اور جو پہلوی زبان سے بھی بہت مختلف ہے اس لئے یہ بات ہونا ضرور ہے کہ فردوسی اس زبان سے واقف تھا۔ یا کوئی شخص ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن تذکروں اور خود فردوسی کے بیان میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں؛

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق دیباچہ میں اور چند روایتیں مذکور ہیں، واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ہم ان کو بھی نقل کرتے ہیں، لیکن جہاں ان میں بدیہی غلطی ہے، ہم اسکی تغلیط کردیں گے،

ساسانیوں کو ایران کی تاریخ کے مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا، اور ان میں سے نوشیرواں کو سخت شغف تھا، چنانچہ تمام دیار و اطراف میں نمائندے بھیجکر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے، یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لیکر خسرو پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کردے، دانشور مذکور مدائن کے رؤسا میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا، اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دیکر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی۔

عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپ نے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ خرافات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں، غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہوکر حبش پہنچی، بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا، وہاں سے ہندوستان پہنچی، یعقوب لیث نے اپنے زمانہ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ تاج الدین خراسانی ہروی، یزدان داد شاہ سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا، یہی کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی، اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا

اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی، وہاں ترجمہ ہوکر پھر ہندوستان پہنچی، ہندوستان سے ایران میں آئی، صریح غلط اور بیہودہ ہے، باقی واقعات صحیح ہوں تو عجیب

نہیں، یعنی ایران کی کوئی قدیم تاریخ جو یزدگرد کے عہد میں تیار ہوئی تھی، یعقوب لیث کے زمانہ میں پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو؛

دیباچہ کی دوسری روایت یہ ہے۔ کہ نوشیرواں کے خاندان کا ایک شخص سلطان محمود کے زمانہ میں تھا، اس کا نام خور فیروز تھا، اور فارس میں سکونت رکھتا تھا، زمانہ کے انقلاب سے آوارہ وطن ہوکر، غزنین پہنچا، یہاں آکر چرچا سنا کہ سلطان محمود تاریخ عجم کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اس کے وطن میں یہ کتاب موجود تھی، چنانچہ وہاں سے منگواکر سلطان کی خدمت میں پیش کی، اور مورد انعام ہوا،

تیسری روایت یہ ہے کہ جب تمام ملک میں سلطان محمود کے شوق کے چرچے پھیلے تو بادشاہ کرمان نے ایک شخص کو جس کا نام آذر برزین تھا، اور شاپور ذوالاکتاف کے خاندان سے تھا، اور اس وجہ سے تاریخ ایران کا بڑا سرمایہ اس کے پاس تھا، اس کو سلطان محمود کی خدمت میں بھیجا،

شاہنامہ کی وقعت تاریخ کے لحاظ سے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخی درجہ سے گرادیا ہے، تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی؛

ملکم صاحب بھی تاریخ ایران میں اعتراف کرتے ہیں،

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ و خیالات شاعری بسیار دارد، لکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ممالک آسیا (ایشیا) یافت می شود دراں مندرج است؛"

ملکم صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنامہ کے واقعات کا یونانی مورخین کے بیان سے مقابلہ کیا ہے۔ اور اکثر جگہ دونوں میں تطبیق دی ہے، علامہ ثعلبی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، ایران کی قدیم تاریخ پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس نے بھی جا بجا شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے، تاریخی حیثیت سے شاہنامہ کی بے اعتباری کی بڑی وجہ جو آج کل خیال کی جاتی ہے، وہ اس کے دور از کار افسانے ہیں۔ مثلاً دیو سفید، مار ضحاک۔ جام کیخسرو وغیرہ وغیرہ، لیکن اولاً تو چند واقعات کی بنا پر تمام کتاب کو غلط نہیں کہہ سکتے، ہیروڈوٹس کو تمام یورپ تاریخ کا آدم مانتا ہے، لیکن اس کی تاریخ میں ہزاروں واقعات فرضی اور وہمی ہیں، اور خود یورپ کو اس کا اعتراف ہے، دوسرے ایرانیوں کی قدیم تاریخ میں واقعات اسی طرح مذکور تھے،

اس لئے فردوسی کا صرف یہی فرض تھا۔ کہ ان واقعات کو بعینہ نقل کردے، علامہ ثعلبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ تمام افسانے گو بالکل بے سروپا اور خلاف عقل ہیں، لیکن چونکہ ایران کی کی تاریخ میں یہ تواتر بیان ہوتے چلے آتے ہیں، اس لئے ہمارا صرف اس قدر فرض ہے کہ جوں کا توں ان کو نقل کردیا جائے، علامہ موصوف کے یہ الفاظ ہیں، (ذکر قصۂ زال و سیمرغ)

وان ابرء من عهدة هذه الحكاية ولولا تغيرها بكل مكان وفي زمان وعلى كل لسان وجديها بجري ما يستطاب ويلهي به الملوك عند الارق لما كتبتها وقد كانت العجائب كثيرة في ذالك الزمان الاول كبلوغ عمر الواحد من اهله الف سنة وكطاعة الجن والشياطين الملوك ... وغيرها مما يطول ذكره (جلد اول صـ مطبوعہ یورپ)

اسی طرح ہفت خوان رستم کے ذکر میں لکھا ہے، کہ یہ سب لغویات ہیں،

ابوریحان بیرونی آثار الباقیہ میں لکھتا ہے،

| | |
|---|---|
| ولهم في التواريخ القسم الاول | ایرانیوں نے پہلے زمانہ کی تاریخ لکھی ہے |
| اعمار الملوك افاعليهم المشهورة | سلاطین کی عمروں اور انکے کارناموں کے متعلق |
| فهم ما يستفزهم استماع القلوب | ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جن کے سننے سے دل اچھٹا ہے کان |
| وتمجه الآذان ولا تقبله العقول | انکو برداشت نہیں کرسکتے عقل انکو قبول نہیں کرتی |

بعض یوروپین مورخین کے نزدیک شاہنامہ کی بے اعتباری کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کے واقعات یونانیوں کی تاریخ سے اکثر جگہ مخالف ہیں، لیکن اس عقدہ کو علامہ ثعلبی نے بہت پہلے حل کردیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ ہیں، ایرانی اور یونانی، ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن یہ مسلم مسئلہ ہے۔ کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے، اس لئے ہمنے یونانیوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا؛

**محققین یورپ کی رائے** یورپ نے نہایت جدوجہد سے اسلام کے قبل کی ایرانی تصنیفات کثرت سے ڈھونڈ نکالیں، اور ان میں سے اکثر کو چھاپ کر شائع کیا، چنانچہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے "پہلوی لٹریچر" اس کے ذیل میں ان تمام کتابوں کی فہرست اور ان کے حالات لکھے ہیں، ان میں بعض کتابیں اسلام سے پانچ پانچ سو، چھ چھ سو برس پہلے کی تصنیف ہیں، ان میں سے بعض جو کتابیں شاہان عجم کی تاریخ ہیں، ان بیان حرف بحرف

---

۱؎ مطبوعہ یورپ،

فردوسی سے مطابق ہے، انہی میں ایک کتاب کارنامک ارتخشتر ہے جو پہلوی زبان میں ہے، اور ؁۶۰۰ء یعنی زمانۂ اسلام سے کسی قدر پہلے کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصل پہلوی زبان میں مع جرمنی ترجمہ کے شائع کی گئی ہے، اس کی نسبت براؤن صاحب لکھتے ہیں،

"جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اس کی وقعت یہ دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، ان سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے"، جرمن کے مشہور فاضل پروفیسر نولدکی نے شاہنامہ کے ماخذ اور اس کی تاریخی حیثیت پر ایک مستقل کتاب جرمن زبان میں لکھی ہے، اس کے اقتباسات کا ترجمہ مسٹر براؤن نے انگریزی میں کیا ہے، اور اپنی کتاب کی جلد اول میں شامل کیا ہے، ہم اس کے بعض ضروری مقامات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں،

**تاریخ و مقدمات** "اوستا میں شاہنامہ کی فصلوں کا اتنا ذکر آچکا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اوستا تصنیف ہوئی تو اس زمانہ میں ان قومی فسانوں کی بڑی بڑی باتیں لوگوں کو معلوم معلوم تھیں، ان کی قدامت کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں ہے، کیونکہ نولدکی نے دکھلایا ہے کہ یونانی مصنفوں کی کتابوں میں بھی جو انہوں نے شاہان ایران کے بارہ میں لکھی ہیں، ان بہادروں کا تذکرہ موجود ہے، خاص کر ٹی سی-ایس[1] کی کتاب میں جو پانسو برس قبل حضرت مسیح، آرٹا زرک[2] سیز[3] منن کا طبیب دربار تھا، اور اس نے اپنی کتاب ایرانی تصانیف کی مدد سے لکھی ہے[4]، یہ واقعات باربار بیان ہوئے ہیں، بلکہ کبھی ایک خاندان سے منسوب ہوئے ہیں، کبھی دوسرے سے، مثلاً سائرس[4]، ایکمی نین[5] کے پہلے بادشاہ کو جو واقعات میڈیا[6] والوں سے لڑتے میں پیش آئے وہ اردشیر ساسانی اور اس کی پارتھیوں[7] کی جنگ کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اسی طرح عقاب سیمرغ اور ہما شاہ پسند پرندوں کا اسے کی می تیرداد[1] اور اردشیر کا محافظ ہونا اسی طور پر مذکور کیا گیا ہے اور پیروز ساسانی کو تورانی دشمنوں سے قارن کے خاندان کے دو شخصوں کا بچانا اور اسی قبیل سے دارا اور پیروز کی ملتی جلتی سرگذشتیں ہیں جو قابل غور ہیں۔

---

۱ Achaememes ۲ Zapiatrs ۳ Hystespes

۴ Odatis ۵ Athessaeus ۶ Charas

۷ Yathar-i-taniran

بات کار زریراں | زریادریس[2] براور مس ٹامس[3] میس اور شاہزادی اوداتش[4] کا قصہ ہم تک ایتھنیز[5] سے پہنچا ہے، یہ قصہ اس نے سکندر کی اس تاریخ سے لکھا ہے جو اس کے دیوان[6] چاریز نے تصنیف کی تھی، یہی داستان سب میں پرانی پہلوی کتاب یات کار زریراں[7] میں بیان ہوئی ہے، جو پانسو برس قبل حضرت عیسیٰؑ کے لکھی گئی تھی، یہ چھوٹی مگر ضروری کتاب سب میں قدیم فارسی کتاب ہے۔ جس میں بہادری کے قصے درج ہیں، گو اس میں ایک ہی قصہ ہے، مگر اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُسے ان کل کہانیوں پر عبور رہے، اسی کتاب کو شاہنامہ کہتے ہیں"

نولدکی کہتا ہے کہ "اگر ہم کو سراسر دھوکا نہ ہوا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قصہ میں وُہ روح موجود ہے جس کا وجود ہے جس کا وجود کئی اور قوموں کے بہادری کے قصوں میں موجود ہے، خلاصہ حال سب کو معلوم ہے، اس کے خاص خاص حصوں کی کوشش کر کے تزئینت دی گئی ہے، اور اس ڈھانچ میں تھوڑی سی کمی بیشی اور ترتیب سے کم و بیش ایک مسلسل اور پوری داستان تیار ہو سکتی ہے، اس قصے کے ضروری اجزاء عربی کے اس مختصر ترجمہ میں موجود ہیں جو طبری نے کیا ہے، اور جو شاہنامہ کے بیان کے بالکل مطابق ہے، بعض جگہ تو لفظ بہ لفظ وہی، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُسی عام قدیمی روایت سے لیا گیا ہے، جو شاہ نامہ کا ماخذ ہے"

اس نئی ترتیب سے جس کی طرف نولدکی نے اشارہ کیا ہے، وہ اضافہ اور اصلاح مراد ہے، جس سے مختلف حصے ایک دوسرے کا پیوند ہو کر ایک دلکش داستان بن جائیں اور کمی سے یہ غرض ہے۔ کہ وہ باتیں اور الفاظ جو مسلمانوں کو ناگوار ہیں نہ آنے پائیں، جیسا فردوسی درادرون نے کیا تھا؛

شاہنامہ کے ساسانی حصہ کے متعلق ہمارے پاس ایک پہلوی کتاب کارنامک ارتخشتر پاپکاں اصل پہلوی اور جرمن میں موجود ہے، جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اس کی وقعت دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے، کارنامک غالباً ۶۰۰ء میں تصنیف ہوئی اور راگا تھی اس کا جو ۸۰۰ء میں تھا شاہان ایران کی تاریخوں کا ساماں پاپک اور اردشیر کے حالات میں حوالہ دیتا، اس بات کا زائد ثبوت ہے، کہ شاہنامہ کے مختلف قصے اس زمانہ کی پہلوی کتابوں میں پائے جاتے تھے،

---

۱ Ctesias ۲ Artaxerxes ۳ Mnemon
۴ Cyrus ۵ Achaemenian ۶ Medes
۷ Parthians

فردوسی کے شاہنامہ پر جو دیباچہ تیمور کے پوتے بالیسنغر کے حکم سے ۸۲۵ھ میں لکھ کر لگایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہقان دانشور کا پورا صحیح نسخہ اس ساری داستان کا کیومرث سے لے کر خسرو پرویز یعنی ۶۲۸ء تک کا یزدجرد ثانی آخری ساسانی فرماں روا کے عہد میں تیار ہو چکا تھا، اس پر نولدکی لکھتا ہے، کہ "یہ کتاب خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مگر عرب مورخوں کے ترجموں کا فردوسی سے خسرو پرویز کی وفات تک مطابق ہونا اور بعد کو مختلف، اس بارہ خاص میں اس کی صداقت کا ثبوت ہے، اور اس کی انتہادرجہ کی ہمدردانہ کوشش اور حق پسندی سے پایا جاتا ہے، کہ وہ بادشاہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تصنیف ہوئی تھی۔"

اس پہلوی خدائی نامہ کا جس کا حمزہ اور مصنف فہرست وغیرہ اور دیگر عرب مورخوں نے ذکر کیا ہے، ابن المقفع نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عربی میں ترجمہ کیا اور اس ذریعہ سے تمام عربی دانوں کو اس کا حال معلوم ہو گیا، مگر نہایت افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ضائع ہو گیا۔ اسی طرح وہ فارسی نظم کا ترجمہ جو ۹۵۵ء میں ابو المنصور المعمری کے حکم سے ہوا تھا، اور ہرات سیستان، شاہ پور اور طوس کے چار پارسیوں نے، ابو منصور ابن عبد الرزاق حاکم طوس کے لئے کیا تھا، جیسا کہ البیرونی اور نولدکی نے لکھا ہے، اسی کی بنا پر دقیقی نے ایک شاہنشاہ نوح ابن منصور سامانی بادشاہ کے لئے جو ۹۷۶-۹۹۷ء تک رہا، فارسی نظم میں لکھنا شروع کیا تھا، مگر سلطنت گشتاسپ اور زردشت کی آمد کے متعلق چند ہی ہزار شعر لکھنے پایا تھا کہ اسے ایک ترکی غلام نے مار ڈالا۔ یہ فردوسی ہی کا حصہ تھا، کہ چند سال اور اس نے قومی فسانے کو جو دقیقی نے شروع کیا تھا، ساٹھ ہزار اشعار میں جن میں دقیقی کے اشعار بھی شامل ہیں تکمیل کو پہنچایا، اتنا کہنا یہاں اور ضروری ہے۔ کہ شاہنامہ قوم کا پورا پورا افسانہ ہے،

داستان اردشیر اس داستان کی جتنی کہانیاں، شاہنامہ اور کارنامک پہلوی میں پائی جاتی ہیں حسب تفصیل ذیل ہیں:۔

(۱) ساسان جو بہمن دراز دست کی پانچویں پشت میں تھا، پاپک شاہ فارس کے ہاں مویشی چرانے پر نوکر ہے، پاپک خواب دیکھتا ہے۔ کہ ساسان نسل شاہی سے ہے، اس سے ملطف وخوشی پیش آتا ہے، اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرتا ہے۔ اور اردشیر اس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے؛

(۲) پابک اردشیر کو متبنٰی کرتا ہے، اس کے جوان ہونے پر اس کی دلاوری، عقلمندی اور شاہانہ خوبیوں کا تذکرہ اردوان (آخری بادشاہ اشکانی) تک پہنچتا ہے؛ وہ اردشیر کو طلب کرتا ہے، خاطر و مدارات سے پیش آتا ہے، ایک روز اردوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو جاتا ہے، اور وہ اردشیر کے مارے ہوئے شکار کو اپنا بتلاتا ہے، اس پر بے قدر ہو کر میر آخور اصطبل شاہی مقرر ہوتا ہے،

(۳) اردوان کی ایک معتمد ہوشیار اور نازنین پرستار اردشیر پر ترس کھاتی ہے اور دو تیز رفتار گھوڑے مہیا کر کے اس کے ساتھ فارس کو بھاگ جاتی ہے اردوان تعاقب کرتا ہے مگر یہ سن کر کہ شوکتِ خسروی ایک خوبصورت مینڈھے کی شکل میں اردشیر تک پہنچ گئی ہے واپس آتا ہے

(۴) اردشیر اشکانیوں وغیرہ سے لڑتا ہے، اردوان اور اس کے بیٹے کو شکست دیتا ہے اور خود کردوں سے زک اٹھاتا ہے؛

(۵) داستان ہفتبان بوخت (ہفتواد) اور کرم کرمانی مع جنگ متھرک (مسرک)

(۶) اردوان اپنی بیٹی (اردشیر کی زوجہ) کو موت کا حکم سناتا ہے، ایک موبد جس کا نام ابرسام ہے اس کی جان بچاتا ہے، اسی کے پیٹ سے شاپور پیدا ہوتا ہے، اور باپ اس بچہ کو لیجاتا ہے،

(۷) اردشیر ہندوستان کے حاکم کید یا کیت سے یہ سن کر کہ ایران کی بادشاہت اسکے یا اس کے دشمن متھرک کے گھرانے میں جائے گی، متھرک کا استیصال کرتا ہے، اس کی ایک لڑکی قتل عام سے بچکر کسانوں میں پرورش پاتی ہے، شاپور اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہوتا ہے، اپنی شادی اور اپنے بیٹے ہرمزد کی پیدائش کو اپنے باپ اردشیر سے چھپاتا ہے، اور ہرمزد کو سات برس کی عمر میں چوگان کے میدان کی بہادری دیکھ کر اردشیر پہچان لیتا ہے۔

ہر متفحص جس نے کارنامک اور شاہنامہ کا یہ حصہ ساتھ ساتھ پڑھا ہے اس بات کا اقرار کرے گا کہ شاہنامہ پورا چربہ کارنامک کا ہے، اس لئے کہ جزئیات میں اختلاف نہیں ہے، ہمارے اس خیال کو کہ فردوسی نے جن قدیم کتابوں سے شاہنامہ لکھا ہے ان سے الگ نہیں کیا، پہلوی کے قصۂ زریر اور شاشاہ کے مقابلہ سے اور بھی تقویت ہو جاتی ہے، یہ امر اتفاقی ہے کہ ان حصوں کا ہم اصل کتابوں سے مقابلہ کر سکے، مگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اور مقامات پر بھی جہاں ہم کو جانچ پرتال کے ذریعے حاصل نہیں ہیں؛ وہاں بھی فردوسی نے

ادبی مابت بھی قدیم ماخذوں کے خلاف نہیں لکھی ہوگی، یہاں ہم داستانِ اردشیر کی دونوں روایتوں میں سے صرف دو ایک باتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، زیادہ گنجائش نہیں ہے، اول ہم اس کی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں:

# کارنامک

سکندر رومی کی وفات پر ایران میں ۲۴۰ مختلف گروہوں کے لوگ حکمراں تھے، اردوان سب میں سربرآوردہ تھا اور اصفہان، فارس اور قرب و جوار کے حصہ پر قابض تھا، پاپک محافظ سرحد اور اردوان کی طرف سے فارس کا گورنر تھا اور اصطخر میں رہتا تھا، اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، جس سے اس کا نام چلتا ساسان پاپک کا گوالا تھا اور ہمیشہ اپنے گلّوں میں رہتا تھا، مگر وہ دارا ابن دارا کی اولاد میں تھا اور سکندر کے بُرے زمانہ میں وہ بھاگ کر گڈریوں میں جا ملا تھا، پاپک کو یہ بات معلوم نہ تھی، ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کے سر سے سورج نکلا ہے، اور اس نے تمام عالم کو منور کر دیا ہے۔ دوسری رات دیکھا کہ ساسان ایک سپید ہاتھی پر جس پر قیمتی جھول پڑی ہوئی ہے سوار جا رہا ہے اور تمام "کشور" کے لوگ اس کے ارد گرد ہیں۔ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں، تیسری رات اس نے دیکھا کہ آتش فروبہ، گشسپ اور مہر، ساسان کے گھر میں روشن ہے اور ساری دنیا میں اُجالا پھیلا ہوا ہے، ان خوابوں سے گھبرا کر اس نے تعبیر دینے والوں اور دانشمندوں کو بلایا اور ان سے تینوں خواب بیان کئے، معبروں نے کہا یا تو وہ شخص جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے یا اس کی اولاد میں سے کوئی شخص تمام دنیا کا بادشاہ ہوگا، کیونکہ سورج اور قیمتی جھول والا ہاتھی، زور، طاقت اور فتح کی علامت ہیں، آتش فروبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذہب سے خوب واقف ہیں اور اپنے ہمسروں میں ممتاز ہیں، آتش گشسپ سے جنگجو اور جرگوں کے سردار اور آتش برجین مہر سے دنیا کے کاشتکار مراد ہیں، پس بادشاہت اُسے یا اُس کی اولاد کو ملے گی۔" پاپک نے یہ تقریر سُن کر سب کو رخصت کیا اور ساسان کو بُلا کر اس سے پوچھا تم کس خاندان اور نسل سے ہو تمہارے بزرگوں اور بڑھوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ ساسان نے کہا کہ اگر جان بخشی

---

۵۷ شاہ نامہ میں اصطرخ لکھا ہوا ہے،

ہو تو عرض کروں، پاپک نے اجازت دی، ساسان نے اپنا راز فاش کر دیا اور سارا حال بتلا دیا، پاپک یہ سُن کر خوش ہوا اور کہا کہ میں تمہاری حالت بہتر کر دوں گا، اور اس کے حکم دیتے ہی پورا لباس شاہی آیا اور ساسان کو عطا ہوا، جب ساسان نے کہا پہنو، اس نے پہن لیا، وہ پاپک کے حکم سے چند روز عمدہ غذائیں کھاتا رہا جس سے اس کے جسم میں طاقت آگئی، پاپک نے پھر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی اور قسمت کی یاوری سے وہ حاملہ ہوگئی اور اس سے فرخندہ پیدا ہوا،

فرجہ، فرہ باگ یا فرین باگ کی جگہ فردوسی نے خرید لکھا ہے، کارنامک کی عبارت جہاں ساسان کی آمد کا ذکر ہے، بڑی روکھی پھیکی ہے، فردوسی نے اپنے زور قلم سے اس میں جان ڈال دی ہے۔ اور یہ منجملہ ان مقامات کے ہے جو فردوسی نے نہایت دلکش پیرایہ میں لکھے ہیں،

## اشعار فارسی متعلق قصہ بابک ساسان

| | |
|---|---|
| چو دارا بہ رزم اندرون کشتہ شد | ہمہ دودہ را روز برگشتہ شد |
| پسر بُد مر او را یکے شاد کام | خردمند و جنگی و ساسان بنام |
| از آں لشکر روم بگریخت اوی | بدام بلا در نیاویخت اوی |
| بہ ہندوستان در بزاری بمرد | ز ساسان یکے کودکے ماند خرد |
| بریں ہم نشاں تا چہارم پسر | ہمے نام ساسانش کردے پدر |
| چو کہتر پسر سوئے بابک رسید | بدشت آمد و سرشباں را بدید |
| بدو گفت مزدورت آید بکار | کہ ایدر گذارد بہ بد روزگار |
| بپذرفت بدبخت را سرشباں | ہمی داشت بارنج روز و شباں |
| شبے خفتہ بُد بابک روز یاب | چناں دید روشن روانش بخواب |
| کہ ساساں بہ پیل ژیاں برنشست | گرفتہ یکے تیغ ہندی بدست |
| چو دیگر شب اندر چو بابک بخفت | ہمی بود با فکرتش اندیشہ جفت |
| چناں دید در خواب کاتش پرست | سہ آتش فروزاں ببردے بدست |
| چو آذر گشسپ و چو خراد و مہر | فروزاں چو بہرام و ناہید و مہر |
| ہمہ پیش ساساں فروزاں بُدے | بہر آتشے عود سوزاں بُدے |

سر بابک از خواب بیدار شد — روان و دلش پر ز تیمار شد
کسانیکہ در خواب دانا بدند — بداں دانش اندر توانا بدند
بہ ایوان بابک شدند انجمن — بزرگان فرزانہ و رای زن
چو بابک سخن برکشاد از نہفت — ہمہ خواب یکسر بدیشان بگفت
پر اندیشہ شد زاں سخن، رہنمائے — نہادہ بدو گوش پاسخ سرائے
سرانجام گفت اے سرافراز شاہ — بہ تاویل این کرد باید نگاہ
کسے راکہ دیدی تو زینساں بخواب — بہ شاہی بر آرد سر از آفتاب
گر ایدوں کہ این خواب از و بگذرد — پسر باشدش کز جہاں برخورد
چو بابک شنید این سخن گشت شاد — بر اندازہ شاں یک بیک ہدیہ داد
بفرمود تا سر شباں از رمہ — بر بابک آمد بروز دمہ
بیامد دواں پیش او با گلیم — پر از برف پشمین و دل پر ز بیم
بپرداخت بابک ز بیگانہ جائے — بیدر شد پرستندہ و رہنمائے
ز ساسان بپرسید و بنواختش — بر خویش، نزدیک بنشاختش
بپرسیدش از گوہر و از نژاد — شباں زو بترسید و پاسخ نداد
از آں پس بدو گفت کاے شہریار — شباں را بجاں گر دہی زینہار
بگویم ز گوہر ہمہ ہرچہ ہست — چو دستم بہ پیماں بگیری بدست
چو بشنید بابک زباں برکشاد — ز یزداں نیکی دہش کرد یاد
بیاورد پس جامہ پہلوے — یکے اسپ با آلت خسروے
یکے کاخ پرمایہ و را بساخت — ازاں پس شبانی سرش برنواخت
بدو داد پس دختر خویش را — پسندیدہ و افسر خویش را

کارنامک پہلوی اور شاہنامہ کے بیان میں بہت خفیف فرق ہے جو عموماً تاریخی واقعات میں ہوتا ہے،

مسٹر براؤن نے اور بھی چند داستانیں کارنامک اور شاہنامہ کی مطابقت دکھانے کے لئے درج کی ہیں، لیکن ہم نے طول کے لحاظ سے قلم انداز کیا ۔

# فردوسی کی وقعت شاعری کی حیثیت سے

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا، انوری اُن شعراء میں ہے، جن لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے، چنانچہ مشہور ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند ٭ ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را ٭ فردوسی و انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے، اور ہم اس کے بندے ہیں،

آفرین بر روان فردوسی ٭ آں ہمایوں نژاد فرخندہ
آں نہ استاد بود و ما شاگرد ٭ آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتے ہیں،

سخن گوی پیشینہ دانای طوس ٭ کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرت الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی، اور در حقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے"

یورپ کے فضلا بھی جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کے کمال شاعری کے معترف ہیں، سر گور اوسلی نے تذکرۃ الشعراء میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے، اگرچہ ساتھ ہی یہ ناقابل بھی ظاہر کی ہے کہ "وہ اگرچہ در اصل ہومر کا ہمسر نہیں ہو سکتا لیکن ایشیا میں اگر کوئی ہومر ہو سکتا ہے، تو وہی ہے"

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانان یورپ میں سب سے ممتاز ہیں، فردوسی کے کمال شاعری کے منکر ہیں، وہ اپنی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں لکھتے ہیں کہ فردوسی کے بعد جو شعراء پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکت الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں، شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کر سکتا، صاحب موصوف کو اس پر حیرت کہ شاہنامہ تمام اسلامی دنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہو گیا، پھر خود اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں، اس لئے جب قوم نے اس کا سکہ جما دیا"

ہم ان سب باتوں کے جواب میں یہ کہتے ہیں،

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نہ زاہد ٭ بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

شاہنامہ کی خصوصیات

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں،

۱- اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا ملک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس قدر اس کو مغلوب کر لیا۔ کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی، اسلام سے پہلے مصر و شام میں قبطی و سریانی بولی جاتی تھی، اسلام کے ساتھ تمام ملک کی زبان عربی ہو گئی یہاں تک کہ آج عیسائی یہودی غیر بھی عربی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں بول سکتے، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ میں ترک گئے تو ملکی زبان ترکی ہو گئی، کابل اور قندھار کی اصلی زبان پشتو ہے، لیکن خاص فارسی بولتے ہیں۔ جو اسلامی حکمرانوں کی زبان تھی، ایران اور ہندوستان سخت جان تھے، جہاں ملک کی اصلی زبان قائم رہی۔ لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہو گئے کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالایلزم کی محنت اٹھانی پڑتی ہے،

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی، عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا، اس کے چار شعر آج موجود ہیں، جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں، رودکی اور ابو شکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے، سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمر نامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی، وہ ہماری نظر سے گزری ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، اسی زمانہ میں شیخ بو علی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے، لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکا؛ فردوسی کی قدرت زبان دیکھو کہ ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دیئے، اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں؛ اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے، لیکن کل ہزار شعر اور صرف چند معمولی واقعات ہیں بخلاف اس کے فردوسی نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا، عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں، مثلاً دین، میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح، غازی وغیرہ وغیرہ، یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے، جس طرح آج کل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ، سٹیشن وغیرہ ہیں۔ کہ ان کے بجائے اگر کوئی شخص اور الفاظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہوں گے،

حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں اور وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں اس کو ادا کرتا ہے۔ کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں، بو علی سینا نے بھی حکمت علائیہ میں یہ کوشش کی، لیکن اس کا نمونہ دیکھو، ابطال غیر متناہی کے استدلال میں لکھتا ہے،

«ہر پیشی و پسے بالطبع است چنانکہ اندر شمار است یا بہ عرض چنانکہ اندر اندازہ

است که از هر کدام سو که خواهی آغاز کنی و هر چه اندر وے پیشی و پسی است بالطبع باوے مقداری ست که اورا بهره‌ها بهر جا که بوند همه بیک جائے حاصل و موجود بود وے متناهی است "

غور کرو اس کوشش کے ساتھ کس قدر عربی الفاظ اب بھی باقی رہ گئے اور جن عربی الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ اس قدر نامانوس اور بیگانہ ہیں کہ عبارت معما ہو کر رہ گئی،

عبارت کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں جب تقدم و تاخر ہوتا ہے۔ تو دو طریقہ سے ہوتا ہے، یا بلا واسطہ جس طرح ایک عدد دو پر مقدم ہے، یا بواسطہ جس طرح مسافت میں آگا پیچھا ہوتا ہے۔ کہ گو ایک حصہ کو مقدم اور دوسرے حصہ کو موخر کہتے ہیں، لیکن جہاں سے چاہیں مسافت کو شروع کر سکتے ہیں، اب قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز میں بالطبع تقدم و تاخر ہوگا، ضرور ہے، کہ اسمیں ہو۔ اور مقدار کے تمام اجزاء مرتب ہوں، یہ بھی ضرور ہے، کہ ایسی چیز متناہی ہو،

غور کرو، بوعلی سینا کی عبارت سے کیا کوئی شخص یہ مطلب سمجھ سکتا ہے؟

فردوسی نے آغاز کتاب میں مخلوقات کی پیدایش کی ابتدا، عناصر کا وجود، اور ان کی ترتیب اور انقلابات لکھے ہیں،

از آغاز باید که دانی درست — سرمایۂ گوهران از نخست
که یزدان ز ناچیز چیز آفرید — بدان تا توانائی آمد پدید
وزو مایۂ گوهر آمد چهار — برآورده بے رنج و بے روزگار
نخستین که آتش ز جنبش دمید — ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
وزان پس ز آرام سردی نمود — ز سردی همان باز ترّی فزود
چو این چار گوهر بجاے آمدند — ز بهر سپنجی سرائے آمدند
گیا رست با چند گونه درخت — بزیر اندر آمد سرانشان رخت
ببالد ندارد جز این نیروے — نپوید چو پویندگان هر سوے
نگه کن برین گنبد تیز گرد — که درمان ازوی ست زو است درد
نه گشت زمانه بفرسایدش — نه این رنج و تیمار بگزایدش
نه از گردش آرام گیرد همی — نه چون ما تباهی پذیرد همی

یونانیوں کے نزدیک آفرینش کی ابتدا اور اس کی تاریخ یہ ہے کہ خدا نے مادہ پیدا کیا، مادہ

سے عناصر پیدا ہوئے، حرکت سے آگ پیدا ہوتی، آگ کی گرمی نے یبوست پیدا کی جس سے خاک کا وجود ہوا، پھر سکون کی وجہ سے رطوبت پیدا ہوئی، رطوبت نے پانی پیدا کیا، اس طرح چار عنصر پیدا ہوئے، پھر نباتات کا وجود ہوا، جن میں صرف نمو کی قوت ہے، متحرک بالارادہ نہیں،

آسمانی کی نسبت یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ابدی ہیں، اور امتدادِ زمانہ سے ان میں تغیّر اور زوال نہیں ہو سکتا، فردوسی نے ان مسائل کو ایسے سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کیا ہے۔ کہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ خیال بھی نہیں ہوتا۔ کہ ان میں فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں، لیکن درحقیقت سب فلسفہ کے خاص الفاظ ہیں، ان کے مقابل کے عربی الفاظ دیکھو،

| | | | |
|---|---|---|---|
| سرمایہ | مادّہ | توانائی | وجود |
| گوہر | عنصر | جُنبش | حرکت |
| آرام | سکون | پوینده | متحرک بالارادہ |
| گشتت | دوراں | فرمودان | تغیّر |
| تباہی | فنا | | |

اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں، ہم نے صرف نمونہ دکھایا ہے،

۲۔ ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا، یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے مُلکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھل سکے، یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے، لیکن شاہنامہ اس سے مستثنیٰ ہے، شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے، لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اُس زمانہ کی تہذیب و تمدّن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے، بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا، امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے، عرض معروض کرنے کے کیا آداب تھے، انعام و اکرام کا طریقہ کیا تھا، بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا؟ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے، نامہ و پیام کا کیا انداز تھا، مجرموں کو کیونکر سزائیں دی جاتی تھیں بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کی جاتی تھی، وغیرہ وغیرہ،

دوسری خصوصیت

شادیوں کے کیا مراسم تھے، جہیز میں کیا دیا جاتا تھا، عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں، دولہا اور دلھن کا کیا لباس ہوتا تھا، پیش خدمت غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا، خط و کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے، خاتمہ کی عبارت کیا ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے، ان کو کیونکر بند کرتے تھے، کس چیز کی مہر لگاتے تھے، مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا، زمینوں کی کیا تقسیم تھی، مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں، ٹیکس کیا کیا تھے، کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے،

یہ تمام باتیں شاہنامہ سے بہ تفصیل معلوم ہوتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم چند مثالیں نقل کرتے ہیں،

(۱) بیژن کی مہم میں کیخسرو نے رستم کو زابل سے بلایا ہے، اور اس کے لئے باغ میں دربار کیا ہے، دربار میں تخت زریں بچھایا گیا ہے، اس پر ایک مصنوعی درخت نصب ہے، جس کا سایہ بادشاہ پر پڑتا ہے، درخت چاندی کا ہے، یاقوت کی شاخیں ہیں، موتیوں کے خوشے دانے ہیں طلائی، ترنج اور سیب پھلے ہوئے ہیں، جو مجوف ہیں، اور اُن کے اندر مشک کا برادہ ہے ہوا جب چلتی ہے تو مشک جھڑتی ہے، اسی کے قریب وہ فرش تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح میں آیا تھا) ان تمام باتوں کو فردوسی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے،

در باغ بگشادہ سالار بار | نشستگہے ساخت لیس شاہوار
بفرمود تا تاجِ زرین و تخت | نہادند زیرِ گل افشاں درخت
درختے زدند از بر گاہ شاہ | کجا سایہ گسترد بر تاج و گاہ
تنش سیم و شاخش ز یاقوت زر | بر و گونہ گوں خوشہا ے گہر
عقیق و زبرجد، ہمہ برگ و بار | فروہشتہ از شاخ چوں گوشوار
ہمہ بار زریں ترنج و بہی | میان ترنج و بہی بُد تہی
بدو اندروں مشک سودہ بہ مے | ہمہ پیکرش سفتہ بر سان نے
کرا شاہ بر گاہ بنشاندے | برا دبا وزاں مشک بفشاندے
بیامد نشست او بہ زرینہ تخت | بسر برش ریزندہ مشک از درخت
ہمہ مے گساران بہ پیش اندرا | ہمہ برسراں افسر از گوہرا
ہمہ طوق بر سینہ و گوشوار | بہ بر بر ہمہ جامۂ زر نگار

(۲) افراسیاب نے جب اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی سیاوش سے کی ہے، اور فرنگیس سیاوش کے گھر آئی ہے، تو اُس کی مہمانی اور عروسی کے ساز و سامان کو اس طرح بیان کیا ہے

بہ گنج انچہ بد اندروں نامدار — گزیدند ز ربفت چینی ہزار
زبرجد طبقہا و فیروزہ جام — پر از نافۂ مشک و پر عود خام
دو افسر پر از گوہر گوشوار — دو یارہ، یکی طوق دو و گوشوار
ز گستردنیہا شتروار شصت — ز زربفت پوشیدنیہا سہ دست
یکے تخت زرّیں و کرسی چہار — سہ نعلین زرّیں زبرجد نگار
پرستندہ سی صد بہ زرّیں کلاہ — ز خویشان نزدیک صد نیکخواہ
پرستار با جام زرّیں دویست — تو گفتی بہ ایوان درون جائے نیست
ہمی صد طبق مشک و صد زعفران — ہمی رفت گل شہر با خواہران

اسفندیار کا تابوت رستم نے روانہ کیا تھا، تابوت کے مراسم دیکھو،

یکے نغز تابوت کرد آہنیں — بگسترد فرشے ز دیباے چیں
درو اندر اندود یک روے آہن بہ قیر — پراگند بر قیر مشک و عبیر
وزاں پس کہ پوشید روشن برش — ز پیروزہ بر سر نہاد افسرش
چہل اشترے زیر تابوت شاہ — ز بالا فروہشتہ دیباے چیں
یکے اشترے زیر تابوت شاہ — چپ و راست اشتر پس اندر سپاہ
پشوتن ہمی رفت پیش سپاہ — بریدہ فش و دم اسپ سیاہ
برو بر نہادہ نگونسار زیں — ز زیں اندر آویختہ گرز کیں
ہماں نامور خود و خفتان اوے — ہماں ترکش و مغفر جنگجوے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں کسی امیر کا جنازہ نکلتا تھا تو لوہے کے تابوت میں رکھ کر لے جاتے تھے، تابوت کے ایک رُخ کو سیاہ رنگ سے رنگ دیتے تھے، پھر اس پر مشک و عنبر چھڑکتے تھے، میت کو کپڑے پہناتے تھے اور سر پر تاج رکھتے تھے، اور اس کے دائیں بائیں اور بہت سے اونٹ ساتھ ساتھ چلتے تھے، پیچھے فوج ہوتی تھی، میت کی سواری کا گھوڑا ساتھ ہوتا تھا، اسکی ایال اور دُم کاٹ دیتے تھے، زین اُلٹ کر رکھتے تھے، میت کے اسلحۂ جنگ زین پر لٹکتے تھے

تیسری خصوصیات

(۳) ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ ہے۔ کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں

کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے، تو اس قدر پھیلتے ہیں، کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں، نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ، اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں، لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعوےٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے، اور صرف واقعہ نگاری کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے، بیژن اور منیژہ کی صحبت عیش کو جہاں لکھا ہے لکھتا ہے،

نشستند گُرد و دو می ساختند — ز بیگانہ خرگہ بپرداختند
پرستندگان ایستادہ بپاے — ابا بربط و چنگ و رامش سراے
بہ زیبا زمین کردہ طاؤس رنگ — ز دیبا رو و دیبا چو پشت پلنگ
چو از مشک و عنبر چہ یاقوت و زر — سراپردہ آراستہ سربسر
مے سالخوردہ بجام بلور — برآوردہ با بیژن گیو زور،
سہ روز و سہ شب شاد بودہ بہم — گرفتہ بر او خواب مستی ستم

زال اور رودابہ کے عاشقانہ اختلاط میں زیادہ پھیلا ہے، پھر بھی رنگ ہے،

گرفت آن زمان دست دستان بدست — برفتند ہر دو بکردار مست
سوئے خانۂ زر نگار آمدند — بدان مجلس شاہوار آمدند
شگفت اندران ماند بد زال زر — بدان روے بالا و آن موی و فر
دو رخسارہ چون لالہ اندر چمن — سر جعد زلفش شکن در شکن
ز دیدنش رودابہ می نارمید — بدزدیدہ در وے ہمی بنگرید
ہمی بود بوس و کنار و نبید — مگر شیر[1] کو گور را نشکرید

۴۔ عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا، بے شبہ یوسف زلیخا میں اس کی شاعری کا رتبہ بہت گھٹ گیا ہے، لیکن یہ اس کے رنج و غم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا، جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے، یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا، جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے۔ کہ اس نے مجوسیوں کی مدح و ثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی، لیکن شاہ نامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے، شاعری کا آئینہ دار نظر آتا ہے،

چوتھی خصوصیت

---

[1] یعنی دیکھو شیر نے گورخر کو دیکھ کر شکار نہیں کیا،

زال رودابہ پر عاشق ہوا ہے، اس کے شوق میں گھر سے نکلا ہے، اس کو خبر ہوتی ہے، وہ لب بام آکر کھڑی ہوتی ہے، زال کوٹھے کے برابر آکر اوپر جانے کی تدبیریں سوچتا ہے، رودابہ اپنی چوٹی کھول کر لٹکا دیتی ہے۔ کہ اس کے سہارے چڑھ آؤ۔ زال زلف کو بوسہ دیتا ہے، اور کمند ڈال کر کوٹھے پر جاتا ہے۔ دونوں مل جُل کر بیٹھتے ہیں، لُطف و محبت کی باتیں ہوتی ہیں، شراب کا دور چلتا ہے، یہ سماں دیکھو کس طرح دکھایا ہے،

سپہبد سوے کاخ بنہاد روے — چناں چوں بود مردم جُفت جوے
برآمد سیہ چشم (زال) گُل رُخ بہ بام — چو سرو سہی بر سرش ماہِ تام
چو از دور دستان (زال) سام سوار — پدید آمد آں دُخترِ نامدار
دو بیجادہ بکشاد و آواز داد — کہ شاد آمدی ای جواں مردِ شاد
پر تیرہ (یعنی تب) گفت و سپہبد شنود — ز سر شعر گلنار بکشاد زود،
کمندی کشاد او ز سرو (زال) بلند — کس از مشک زاں ساں نہ پیچد کمند،
خم اندر خم و مار بر مار بود — براں عنبریں تار بر تار بود
فرو ہشت گیسو ازاں کنگرہ — کہ باز بد و شد تا بہ بن یکسرہ
پس از بارہ رودابہ آواز داد — کہ اے (کہا کہ اے) پہلواں بچۂ گرد زاد
بگیر ایں سر گیسو از یک سویم — ز بہر تو باید ہمے گیسویم
بداں پروراندیم ایں تار را — کہ تا دستگیری کند یار را
نگہ کرد زال اندراں ماہروے — شگفتی بماند اندراں (رو) و موے
بسائید مشکیں کمندش بہ بوس — کہ بشنید آواز بوسش عروس
چنیں داد پاسخ کہ ایں نیست داد — چنیں روز خورشید روشن مباد
کمند از رہی بستد و داد خم — بیفگند بالا، نزد ہیچ دم
بہ حلقہ در آمد سرِ کنگرہ — بر آمد ز بن تا بسر یکسرہ
چو بر بام آں بارہ بنشست باز — بیامد پری روے و بردش نماز

(آگے کے اشعار اوپر گزر چکے)

تم کہوگے کہ رودابہ نے زال کو کہیں جواں مرد، کہیں پہلوان بچہ کہہ کے خطاب کیا ہے، اور خود فردوسی رودابہ کی تعریف میں بالا اور فر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے؛

حالانکہ نرم کی لطافت اور نزاکت ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ فردوسی کی نکتہ سنجی اور بلاغت شعاری کی دلیل ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ کابل و زابلستان کے محبوب کا ذکر کر رہا ہے. لکھنؤ کا نہیں، وہاں کے لوگ آج بھی اپنے پیالے اور چیتے کی نسبت یہی الفاظ بولتے ہیں، کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا، بلکہ بالیدہ قامت، پُر اندام، اور تنومند ہوتا ہے اس لئے بالا اور فر کا لفظ وہاں کے معشوق کی اصلی تصویر ہے،

بیرون جب افراسیاب کی سرحد میں پہنچتا ہے تو گرگین نے اس سے بیان کیا کہ یہاں سے پاس ایک مرغزار ہے، جہاں سال میں ایک دفعہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو آتی ہے' اور ہفتوں رہتی ہے، دیکھو فردوسی نے اس موقع پر مرغزار کی بہار اور پریوں کے جھرمٹ کی تصویر کس طرح کھینچی ہے؛

همه بیشه و باغ و آب روان ... یکے جایگاه از در پهلوان
زمیں پرنیان و ہوا مشک بوے ... گلابست گوئی گمر آب جوی
خم آورده از بار شاخ سمن ... صنم شد گل و گشت بلبل شمن
خراماں بہ گرد گلاں بر تذرو ... خروشیدن بلبل از شاخ سرو
پریچہرہ بینی ہمہ دشت و کوہ ... بہر سو بہ شادی نشستہ گروہ
همه دخت ترکان پوشیده رُخے ... همه سرو قد و همه مشک بوے
همه رُخ پر از گل، همه چشم خواب ... همه لب پر از مے بہ بوے گلاب

اخیر شعر پر غور کرو "ہمہ چشم خواب" کے مبالغہ اور بیاختگی پر متاخرین کے ہزاروں تکلفات اور مضمون آفرینیاں نثار ہیں،

ایک اور موقع پر ایک پری چہرہ کی تصویر کھینچا ہے،

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند ... بہ بالا بہ کردار سرو بلند
دو برگ گلش سوسن می سرشت ... دو شمشاد عنبر فروش از بہشت
بناگوش تابندہ خورشید دار ... فرو ہشتہ زو حلقہ گوشوار
لباں از طبرزد زباں از شکر ... دہانش مکلل بہ درّ و گہر

ان سادہ اور فطری مبالغوں کو دیکھو "لباں از طبرزد زباں از شکر"

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کی رسم ایرانیوں میں بھی قدیم سے ہے،

لیکن یہ سمجھنا۔ کہ وہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، اس انداز میں بھی وہ کسی سے کم نہیں،

سہراب نے جب ایران کی سرحدی میں پہنچ کر قلعہ سپید کا محاصرہ کیا ہے تو قلعہ سے ایک عورت مردانہ لباس پہن کر نکلی ہے، اور سہراب سے جنگ آزما ہوئی ہے؛ دیر تک ردوبدل کے بعد سہراب نے اس کو گرفتار کیا، جھلم چہرے سے ہٹی تو معلوم ہوا کہ عورت ہے، سہراب فریفتہ ہو گیا، لیکن عورت فریب دیکر نکل گئی۔ سہراب، اب سپہگری چھوڑ کر عشق کا دام بھرنے لگا، دیکھو فردوسی اُس کے نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہے،

همی گفت از آں پس دریغا دریغ | کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
غریب آہوئے آمدم در کمند | کہ از بند جست و مرا کرد بند
عجب ہرن میری کمند میں آیا | کہ خود چھوٹ کر نکلگیا اور مجھ کو قید میں ڈال گیا
زہی چشم بندے کہ آں پُر فسوں | بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں
اس شعبدہ کو دیکھو کہ اس جادوگر نے | مجھ کو تلوار نہیں ماری لیکن میں قتل ہو گیا
ندانم چہ کرد آں فسوں گر بہ من | کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
بزاری مرا خود ببایدگریست | کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست
همی گفت وہ میسوخت از غم بسے | نمی خواست رازش بداند کسے
دلے عشق پنہاں نماند کہ راز | بمردم نماید، همی عشق باز
غم جاں برارد خروش از دروں | اگر چند عاشق بود ذوفنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں، استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے، شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں، ع کہ از بند جست و مرا کرد بند، ع بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں، یہ سب کچھ ہے، لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا۔ کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے، محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں، اس لئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے، اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے۔

ازاں کار ہوماں نبودش خبر | کہ سہراب را ہست خوں در جگر
دلے از فراست بدل نقش بست | کہ او را پریشانئے در دو ست
چہ دام کسے پائے بند آمدہ است | ز زلف بُتے در کمند آمدہ است

نہاں میکند درد و خونیں دل است | ہوس میرود راہ و پا در گل است
یکے فرصتے جست و گفتش براز | (یعنی بہوش میرود) کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکران جواں | نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسم جہانگیری و سروری است | کہ از مہر ماہے بباید گریست
ز توران بہ کارے بروں آمدیم | شناور بدریاے خون آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بکام | ولے ہست در پیش رنجے تمام
بباید شہنشاہ کاؤس و طوس | چو رستم کہ بر شیر دارد فسوں

پھر بہت سے ایرانی پہلواؤں کے نام گنا کر کہتا ہے،

تو ای مرد میدان ایں سروراں | چہ کارت بہ عشق پری پیکراں
تو کارے کہ داری نہ بردی بسر | چرا دست بازی بہ کار دگر
بہ نیروی مردی جہاں را بگیر | ز شاہان بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدست تو آید فراز | بہر جائے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد | دلش بستہ بند بیکار شد
بگفت اے سر نامداران چیں | بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروی جان من | کنوں با تو نو گشت پیمان من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب | در آرم بفرمان افراسیاب
بگفت ایں و دل راز دلبر بکند | برآمد بر افراز تخت بلند

دیکھو شجاع دام عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے، فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلایا، اور پھر متانت اور شائستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹا، متاخرین بلکہ نظامی و سعدی کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے،

پانچویں خصوصیت

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے، ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیشرو اور امام ہے، وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے، ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعرا کا پیشرو اور امام ہے، وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے، اس کے تمام جزئیات اور گرد و پیش ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتا ہے، پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو بہو

ادا کرتا ہے۔ کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعرا یا تو واقعہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں لیکن طبیعت فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہے، لیکن زبان قدرت نہیں کہ جیوں کا توں ادا کر دے، اس لئے یہ بات کو بدل کر کہتے ہیں یا استعارات و تشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، تم دیکھتے ہو کہ فردوسی استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا، تشبیہیں وہی پاس پاس کی لیتا ہے، مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہے، اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ ان باتوں میں قاصر ہے، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈال دیتی ہیں، اور اس کا اصلی خط و خال نظر نہیں آتا، غور کرو، یہ لکھنا مقصود ہے کہ خاقان چین ہاتھی پر ہے، رستم نے کمند پھینکی اور اس کو گرفتار کر کے ہاتھی سے ٹپک دیا، فردوسی اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

چو از دست رستم رہا شد کمند — سر شہریار اندر آمد بہ بند
ز پیل اندر آورد و زد بر زمیں — بہ بستند بازوے خاقان چین

نظامی کو اسی قسم کا موقع پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار — بینداخت چوں چنبر روزگار

بے شبہ عدو بند کے لفظ سے جملہ کی ترکیب چست ہو گئی "چنبر روزگار" کی تشبیہ نے بھی ندرت پیدا کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن سننے والے پر یہ اثر ہوا کہ اصل واقعہ کے بجائے اس کی توجہ الفاظ اور تشبیہ کی طرف متوجہ ہو گئی، اور کمند میں گرفتار ہونے کی اصلی حالت سامنے نہ آسکی، یہی نکتہ ہے کہ فردوسی واقعات اور جذبات کے بیان کرنے میں استعارات و تشبیہات وغیرہ سے بہت کام لیتا ہے، اور جب اس کو طباعی اور انشا پردازی کا زور دکھانا ہوتا ہے، تو دوسرے موقعے تلاش کرتا ہے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے!

واقعہ نگاری کے دقیق نکتوں پر اس کی نظر جس طرح پڑتی ہے، اس کی ایک دو مثالیں ہم لکھتے ہیں،

پہلوان جب جوش شجاعت میں لبریز ہوتا ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کچھ نہیں، تنہا بیٹھا ہے، لیکن آپ ہی بھیرا پڑتا ہے، اور جوش میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، سہراب جب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار پر نظر ڈال کر ہجیر سے ان کا نام و نشان پوچھتا ہے تو اس کی نظر رستم پر پڑتی ہے، اور ہجیر سے کہتا ہے، یہ کون شخص ہے جس کی یہ حالت ہے، کہ

بخود ہر زماں بر خروشد ہمے — تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے

آپ ہی آپ بپھر رہا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دریا جوش مار رہا ہے

ایک جسیم اور تناور پہلوان کبھی تخت پر بیٹھا ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے تخت پر چھایا جاتا ہے، اس حالت کو فردوسی نے اُس موقع پر جب رستم سہراب کے دیکھنے کو گیا ہے۔ اور سہراب تخت پر بیٹھا ہوا اپنے پہلوانوں سے باتیں کر رہا ہے، اِس طرح ادا کیا ہے، ع

تو گفتی ہمہ تخت سہراب بود

سہراب نے کیکاؤس کے خیمہ کے پاس جاکر برچھی سے خیمہ کی میخیں اکھاڑ کر پھینک دی ہیں، فردوسی، اس واقعہ کو اس طرح ادا کرتا ہے،

ازاں پس بجنبید از جائے خویش  بہ نزدیک پردا سرا رفت پیش
خم آورد پشت و سنان ستیج  بر د تند و برکند ہفتاد و میخ
سرا پردہ یک بہرہ آمد زپائے  ز ہر سو برآمد دم کرّہ نائے

عام شعراء اگر اس واقعہ کو لکھتے تو صرف اس پر قناعت کرتے کہ سہراب نے میخیں اکھاڑ کر پھینکدیں، لیکن یہ خصوصیات کہ "وہ جھکا، جھک کر زور سے نیزہ مارا، ستر میخیں اکھاڑ کر پھینک دیں خیمہ کا ایک حصّہ گر پڑا" نظر انداز کر جاتے، حالانکہ واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لئے ان تمام باتوں کا ادا کرنا ضروری ہے،

اسی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہمکو بہت سے ایسے محاوروں تک رسائی ہوتی ہے جو یوں کبھی عام طریقۂ بیان میں نہیں آسکتے تھے،

مثلاً سہراب نے جب رستم کو گرز مارا ہے تو رستم تلملا جاتا ہے، مگر ضبط سے کام لیتا ہے اور سہراب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اس واقعہ کو اردو کا محاورہ دان صرف اس لفظ سے ادا کرے گا کہ "پی گیا" فردوسی نے بھی صرف محاوروں سے کام لیا، چنانچہ کہتا ہے۔ ع

بہ پیچید و درد از دلیری بخورد، رستم ایک معرکہ میں صرف کمند ہاتھ میں لے کر گیا ہے، حریف سے سوال جواب ہوئے تو اس نے طنز سے کہا کہ "اس دھاگے کے بل پہ نہ اتراؤ" فردوسی اس طنز با محاورہ کو، یہ اسی طرح ادا کرتا ہے،

بدو گفتم ہو آں کہ چندیں مدم  بہ نیروے ایں رشتہ شصت خم

واقعہ نگاری کی مثالوں سے تمام شاہنامہ بھرا پڑا ہے، ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر لیکن مسلسل داستان بیان نقل کرتے ہیں،

یہ وہ موقع ہے کہ سہراب ایک ایرانی پہلوان کو لیکر کیکاؤس کے لشکر گاہ کو دیکھنے چلا ہے فوجیں اپنے اپنے افسروں کے ساتھ الگ الگ ساز و سامان سے آراستہ ہیں سہراب ایک ایک پر نگاہ ڈالتا جاتا ہے اور ہر ایک کا نام و نشان پوچھتا ہے، ایرانی پہلوان جواب دیتا ہے

بدو گفت کز تو بپرسم ہمہ — زگردن کشان وز شاہ رمہ
سراپردۂ دیبۂ رنگ رنگ — بدو اندرون خیمہ ہائے پلنگ
بہ پیش اندروں بستہ صد ژندہ پیل (خواب) — یکے تخت پیروزہ برسان نیل
یکے زرد خورشید پیکر[1] درفش (خوی) — سرش ماہ زرّیں، غلافش بنفش (تیرفتہ)
بہ قلب سپاہ اندروں جائے کیست — زگردان ایران ورا نام چیست
بدو گفت کاں شاہ ایراں بود — کہ بر درگہش پیل و شیراں بود
وزاں پس بدو گفت کز میمنہ — سواران بسیار پیل و بنہ
سراپردۂ برکشید و سیاہ — زدہ گرد او اندر ستادہ سپاہ
بگردا اندرش خیمہ زاندازہ بیش — پس پشت پیلان و شیران بہ پیش (صنعت لطیف)
زدہ پیش او پیل پیکر درفش — بہ نزدش سواراں زرینہ کفش
چہ باشد ز ایرانیاں نام اوے — بگو تا کجا باشد آرام اوے
چنیں گفت کاں طوس نوذر بود — درفشش کجا پیل پیکر بود
بپرسید کاں سرخ پردہ سرائے — یکے لشکرے گش بہ پیشش بپائے
یکے شیر پیکر درفش بنفش — درافشان گہر در میان درفش
پس پشتش اندر سپاہی گراں — ہمہ نیزہ داران جوشن وران
چنیں گفت کاں فر آزادگان — سپہدار گودرز کشوادگان
سپہ کش بود گاہ کینہ دلیر — کہ چل پور دارد چو پیل و چو شیر

اب رستم کی باری آتی ہے،

دگر گفت کاں سبز پردہ سرائے — بزرگان ایران بہ پیشش بپائے
یکے تخت پرمایہ اندر میاں — زدہ پیش او اختر کاویاں
بر او برنشستہ یکے پہلواں — ابا فر و با سفت و یال گواں

---

[1] خورشید پیکر یعنی آفتاب کی صورت کا،

ازاں کس کہ بر پائے پیشش بپاست — نشستہ بیک سراز و بہ ترست

جو شخص سامنے کھڑا ہے — رستم کا قد اس سے بیٹھنے کی حالت میں بھی نکلا ہوا ہے

بہ ایران نہ مردے بہ بالائے او — کمندے فروہشتہ تا پائے او،

ورفششش ببیں اژدہا پیکر است — بزاں نیزہ بر شیر زریں سراست

بجوشد ہر زماں بر خرد شد ہمے — تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے

کہ باشد؟ بنام آں سوار دلیر — کہ ہر دم ہمی بر خروشد چو شیر

ہجیر نے رستم کا نام بدل کر بتایا، سہراب اور افسروں کا حال پوچھتا ہے،

وزاں پس بپرسید کز مہتراں — کشیدہ سراپردۂ بر کراں،

سواران بسیار و پیلاں بپائے — بر آید ہمے نالۂ کر نائے،

میانِ سراپردہ تختے زدہ، — ستادہ غلاماں بہ پیشش رِدہ

ز ایراں بگو نام آں مرد چیست — کجا جائے دارد نژادش زکیست

چنیں گفت کاں پور گودرز گیو — کہ خوانند گرداں ورا گیو نیو،

ز گودرزیاں بہتر و مہتر است — بہ ایراں سپہ برد و بہرہ سر است

بدو گفت زاں سوکہ تابندہ شید — بر آید یکے پردہ بینم سپید

زدیبائے رومی بہ پیشش سوار — رِدہ برکشیدہ فزوں از ہزار

پیادہ سپر دار و نیزہ وراں — شدہ انجمن لشکرے بیکراں

زدیبا فروہشتہ زیبا جلیل — غلام ایستادہ رِدہ خیل خیل

نشستہ سپہدار بر تخت عاج — نہادہ براں عاج کُرسی سلج

چہ نام است ورا زنام آوراں — سپہد نژاد است یا سروراں

بدو گفت سہراب کیں در خور است — کہ فرزند شاہ است و با افسر است

واقعہ نگاری جب اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو اسکو موقع نگاری یعنی آج کل کے محاورہ میں سین دکھانا کہتے ہیں،

چھٹی خصوصیت

جذبات | رزمیہ میں درد و غم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہے، اور آئے بھی تو بلاغت یہ ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے، تاہم کہیں کہیں اس کا موقع پیش آگیا ہے تو فردوسی نے اس میں بھی کمال دکھایا ہے۔ سہراب کے مرنے کی خبر سُن کر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہے، اور جس طرح

اُس نے نالہ و زاری کی ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

خروشید و جوشید و جامہ درید ۔۔۔ بہ زاری بر آں کودک نارسید
برآورد بانگ و غریو و خروش ۔۔۔ زماں تا زماں زو ہمی رفت ہوش
فرو برد ناخن دو دیدہ بکند ۔۔۔ برآورد دود و بر آتش فگند
مرآں زلف چون تاب دادہ کمند ۔۔۔ بہ انگشت بپیچید و از بن بکند
بہ سر بر فگند آتش و بر فروخت ۔۔۔ ہمہ موی مشکیں بر آتش بسوخت
ہمی گفت کاے جانِ مادر کنوں ۔۔۔ کجائی؟ سرشتہ بخاک و بخوں
دو چشمم بہ رہ بود گفتم مگر ۔۔۔ ز سہراب و رستم بیابم خبر
چہ دانستم اے پور کاید خبر ۔۔۔ کہ رستم بخنجر دریدت جگر
دریغش نیامد ازاں روے تو ۔۔۔ ازاں برز و بالا و بازوے تو
بپروردہ بودم تنش را بناز ۔۔۔ بہ رخشندہ روز و شبان دراز
کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت ۔۔۔ کفن بر تن پاک او خرقہ گشت
کنوں من کرا گیرم اندر کنار ۔۔۔ کہ خواہد بدن مر مرا غمگسار
پدر جستی اے گرد لشکر پناہ ۔۔۔ بجاے پدر گورت آمد براہ
چرا نامدم با تو اندر سفر ۔۔۔ کہ گشتی بہ گردانِ گیتی ہمبر
مرا رستم از دور بشناختے ۔۔۔ ترا با من اے پور بنواختے
بینداختے تیغ آں سرفراز ۔۔۔ نکردے جگرگاہت اے پور باز
ہمی گفت و می خست و می کند موے ۔۔۔ ہمیزد کفِ دست بر خوب روے
زخوں او ہمی کرد لعل آب را ۔۔۔ بہ پیش آورید اسپ سہراب
سر اسپ او بر در گرفت ۔۔۔ بماندہ جہانے درو در شگفت
گہے بوسہ زد بر سرش گہ بروے ۔۔۔ ز خوں زیر سمش ہمی راند جوے
بیاورد آں جامہ شاہوار ۔۔۔ گرفتش چو فرزند اندر کنار
بیاورد خفتان و درع و کمان ۔۔۔ ہماں نیزہ و تیغ و گرزِ گراں
بسر بر ہمی زد گراں گرز را ۔۔۔ ہمے یاد کرد آں بر و برز را
بیاورد زین و لگام و سپر ۔۔۔ لگام و سپر را ہمی زد بسر

سہراب کی ماں نے جو کچھ کہا ہے کس قدر سچ اور کس قدر پُر تاثیر ہے، سہراب کے گھوڑے کو گود میں لینا، اس کے ہاتھ پاؤں چومنا، سہراب کے کپڑوں کو بچہ کی طرح آغوش میں لینا، ہتھیاروں کو سر پر مارنا، کس قدر اصلی حالت کی سچی تصویر ہے،

بیژن ایرانی پہلوان تھا، افراسیاب کی لڑکی منیژہ اس پر عاشق ہو گئی اور چوری سے لیجا کر گھر میں رکھا، جب افراسیاب کو خبر ہوئی تو اُس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا، اور منیژہ کو گھر سے نکالدیا، منیژہ بیژن کی تیمارداری اور خبرگیری کرتی تھی، رستم بیژن کے چھڑانے کو سوداگر بن کر گیا، اور توران پہنچکر تجارت کے سامان پھیلائے، منیژہ کو خبر ہوئی، دوڑی ہوئی آئی اور رستم سے بیژن کے حالات بیان کئے، رستم نے اس خیال سے کہ راز فاش ہو جائے، منیژہ کو جھڑک دیا کہ میں بیژن وبیژن کو کچھ نہیں جانتا، منیژہ دل شکستہ ہو کر کہتی ہے،

برستم نگہ کرد و بگریست زار | زخاری بباریدہ خوں در کنار
بدو گفت کای مہتر پر خرد | زتو سرد گفتن نہ اندر خورد
رستم سے کہا کہ اے سردار | اسطرح رکھائی سے جواب دینا آپکے شایاں نہیں
سخن گر نہ گوئی مرانم زپیش | کہ من خود دلے دارم از درد ریش
اگر بات نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن مجھکو آگے سے کھدیڑتے کیوں ہو | میرا دل تو خود مصیبت سے زخمی ہو رہا ہے
چنیں باشد آئین ایراں مگر | کہ درویش را کس نہ گیرد خبر
کیا ایران کا یہی دستور ہے | کہ لوگ غریبوں سے بات نہیں کرتے
زدی بانگ بر من چو جنگ آوراں | نہ ترسی تو از داور داوراں
مجھ کو پہلوانوں کی طرح ڈانٹ بتاتے ہو | تم کو بادشاہوں کے بادشاہ خدا کا کچھ ڈر نہیں
منیژہ منم دخت افراسیاب | برہنہ ندیدہ تنم آفتاب
کنوں دیدہ پر خوں و دل پر ز درد | ازیں در بداں در دو رخسار زرد
برای یکے بیژن شور بخت | فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اختصار اور زور | بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں، کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے، تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پُر زور مختصر جملہ کام دیتا ہے، قرآن مجید میں اوحی الی عبدہ ما اوحی، غشیہم من الیم ما غشیہم جو بات ہے وہ سینکڑوں جملوں سے ادا نہیں ہو سکتی، روم کے فاتح کا مشہور جملہ تم نے سنا ہو گا

جس آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا، شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، سہراب کی پُر درد داستان اس شعر سے شروع کی ہے،

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو — دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

صرف "ایں ہم" نے جو بات پیدا کی ہے ہزاروں تمہید سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی، رستم افراسیاب کو ایک خط لکھتا ہے اور تہدید کے وسیع مضمون کو ایک مصرع میں ادا کرتا ہے،

وگر نہ بکام من آید جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

نظامی نے اپنے تحریر میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن فردوسی کے دو مصرع سب پر بھاری ہیں،

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم دریں پارسی

رستم کی مار دھاڑ ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے،

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اسی میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھا پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند — نشستند و گفتند و برخاستند

**آٹھویں خصوصیت** ۸- صنائع و بدائع، شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں، اسلئے فردوسی کے کلام میں انکو ڈھونڈھنا نہیں چاہیئے، لیکن جو محاسن شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں، مثلاً لف و نشر

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

لف و نشر مع طباق و مقابلہ،

**مبالغہ**

فرو شد بہ ماہی و بر شد بہ ماہ — بن نیزہ و قبہ بارگاہ
زبس گردِ میدان کہ بر شد بہ دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

**رزمیہ شاعری** رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین انواع ہے، یورپ کے نزدیک دُنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اس کا کارنامہ فخر بھی رزمیہ شاعری ہے، مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں، وہ بھی ایک

رزمیہ نظم ہے، اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دیجا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے، رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں، واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دُنیا کی تاریخ میں کوانقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور شور اور پُر رُعب طریقہ سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں، شاہنامہ میں یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں،

ہنگامہ
اور محا

زلشکر برآمد سراسر خروش — زمیں پُرخروش و ہوا پُرخروش
جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ — زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ
درفش از درفش و گروہ از گروہ — گسستہ نشد شب برآمد ز کوہ
درخشیدن تیغہائے بنفش — ازاں سایۂ کاویانی درفش
تو گفتی کہ اندر شب تیر چہر — ستارہ ہمے برفشاند سپہر
زمیں گشت جنباں چو ابر سیاہ — تو گفتی ہمے برنتابد سپاہ،
بلند آسماں چوں زمیں شد زخاک — زہر سو ہمی بر شدہ چاک چاک
دل کوہ گفتی بدرد ہمے — زمیں با سواراں بپرد ہمے
زبس نعرۂ نالۂ کرنائے — ہمے آسماں اندر آمد زجائے
جہاں تیرہ شد روے گیتی زگرد — تو گفتی کہ خورشید شد لاجورد
بزد مہرہ بر کوہۂ ژندہ پیل — زمیں جنب جنباں چو دریائے نیل
زگرد سواراں ہوا بست میغ — چو برق درخشندہ پولاد تیغ
زجوش سواران و آواز کوس — ہوا قیر گوں شد زمیں آبنوس
تو گفتی زمیں موج خواہد زدن — وزاں موج بر اوج خواہد زدن
زبس گرد میداں کہ برشد بدشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
زبس نیزۂ گرز و گوپال و تیغ — تو گفتی ہوا ژالہ بارد ز میغ
زکُشتہ ہمہ دشت آوردگاہ، — تن و دست و سر بود ترک و کلاہ
بجوشید دشت و بتوفید کوہ، — زجوش سواران ہر دو گروہ
تو گفتی کہ روی زمین آہن است — ز نیزہ ہوا نیز در جوشن است

شاہنامہ میں لڑائی کے سامان اور اسلحۂ جنگ کی اس قدر تفصیل پائی جاتی ہے، کہ ہم بہ تفصیل بتا سکتے ہیں، کہ آج سے دو ہزار برس پہلے آلاتِ جنگ کیا کیا تھے، پہلوان اور بہادر کیا کیا ہتھیار لگاتے تھے، لباس جنگ کیا کیا تھے، مثلاً لڑائی کے وقت جو باجے استعمال ہوتے تھے اُن کے یہ نام ہیں، تبیرہ، گاو دم، خرمہرہ، کوس، طبل، نقارہ، کرنا، سرغین،

اسلحہ جنگ یہ تھے :- زرہ، جوشن، خود، مغفر، چار آئینہ، خفتان، ترک، ببر بان، برگستوان،

آلات اور سامان جنگ یہ تھے، گوپال، گرز، تیغ، سپر، ورفہ، خنجر، ژوپین، ناوک خشت، تیر، خدنگ، کمند، سناں، نیزہ، ژوپن، پرتاب، تبرزین، دبوس، قارورہ، شراع، عرّادہ، رایت، علم، درفش، اختر، سراپردہ،

اقسام فوج، قلب، میمنہ، میسرہ، طلایہ، ساقہ، دمدار،

اس زمانہ میں مجموعی فوج کے لڑانے کا فن نہ تھا، اس لئے یہ پتہ نہیں لگتا کہ سپہ سالار کس طریقہ سے فوج کو لڑاتے تھے، رستم اگرچہ سپہ سالار تھا اور شاہنامہ سرتاپا گویا اسی کی داستان ہے تاہم کہیں یہ پتہ نہیں لگتا، کہ اس نے فوج کو کیونکر لڑایا، طریقہ جنگ یہ تھا کہ ایک ایک پہلوان میدان آتا تھا، اور معرکہ آرا ہوتا تھا، ان معرکہ آرائیوں کو فردوسی اس تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے،

لڑائی کے جتنے طریقے تھے، یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا، برچھی چلانا وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں سب بہ تفصیل پائے جاتے ہیں، اور جس چیز کو جہاں لکھا ہے، اس طرح لکھا ہے کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،

کمند اندازی

تہمتن ز الوای شد دردمند ۔۔۔ ز فتراک بکشاد پیچاں کمند
چو آہنگ رزم یلاں داشتے ۔۔۔ کمندے و گرزے گراں داشتے
بیامد بغرید چوں پیل مست ۔۔۔ کمندے بہ بازو و گرزے بدست
بدو گفت کاموس چندیں مدم ۔۔۔ بہ نیروے ایں رشتۂ شصت خم
برانگیخت کاموس جنگی نبرد ۔۔۔ ہم آورد را دید بازور و برد
بینداخت تیغ پرند آورش ۔۔۔ ہمی خواست از تن گسستن سرش
سر تیغ بر گردن رخش خورد ۔۔۔ ببرید برگستوان نبرد،

نیامد تن رخش را زان گزند — گو پیلتن، حلقه کرد آن کمند
ببند اخت و افگندش اندر میان — برانگیخت از جای رخش دمان
بران اندر آورد و کردش دوال — عقابی شده رخش با پر و بال
برای دو لیری بشمشیر و ران — گران شد رکیب و سبک شد عنان
همی خواست آن خام خم کمند — بنیروی تن بگسلاند ز بند
شد از هوش کاموس و بگسست خام — گو پیلتن رخش را کرد رام
عنان را بپیچید و او را ز زین — نگونسار آورد و زد بر زمین
دو دست از پس پشت بستش چو سنگ — به خم کمند اندر آورد چنگ،
تهمتن به بند کمر برد چنگ — گزین کرد یک چوبه تیر خدنگ

تیراندازی

خدنگی برآورد پیکان چو آب — نهاده برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کمان را بدست — بچرم گوزن اندر آمد شکست
ستون کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخواست
چو سوفارش آمد بپهنای گوش — ز چرم گوزنان برآمد خروش
چو پیکان ببوسید انگشت او — گذر کرد از مهرهٔ پشت او،
چو زد تیر بر سینهٔ اشکبوس — سپهر آن زمان دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت ده — فلک گفت احسن، ملک گفت زه

نیزه بازی

برآشفت سهراب و شد چون پلنگ — چو بدخواه او چاره جو شد بجنگ
عنان برگرائید و برداشت اسپ — بیامد بکردار آذرگشسپ
چو آشفته شد شیر، تندی نمود — سر نیزه را سوی او کرد زود
بدست اندرون نیزهٔ جانستان — پس پشت خود گردش آنگه ستان
بزد بر کمربند گرد آفرید — زره بر تنش یک بیک بردرید
ز زین برگرفتش به کردار گوی — که چوگان ز باد اندر آید بروی

کشتی گیری

گرفتند ازان پس دوال کمر — دو اسپ تگاور برآورده پر
یکی بد بدست یل اسفندیار — بدست دگر رستم نامدار
بنیرو کشیدند زین خویشتن — دو گرد سرافراز و دو پیلتن

همی زور کرد این بران آن برین | نه جنبید یک مرد بر پشتِ زین
لب اندر دهان شان شده خون و خاک | همه گبر و بر گستوان چاک چاک
چو رستم ورا دید بفشرد ران | بگردن بر آورده گرز گران
چو تنگ اندر آورد با او زمین | فرو کرد گرز گران را بزین

شاہنامہ کا اثر | شاہنامہ کے مقبول عام ہونے کے مخالف بہت سے اسباب جمع تھے، سب سے مقدم یہ کہ وہ سرتاپا غیر قوموں کا کارنامہ تھا اور مسلمانوں کا جہاں جہاں ذکر آگیا تھا نہایت حقارت سے اُن کو یاد کیا تھا۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو | تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قادسیہ کے معرکہ میں مسلمانوں نے بےنظیر شجاعت کے جوہر دکھائے تھے، فردوسی نے اس کو بھی مدہم کرکے دکھایا تھا، اس بات پر مذہبی گروہ میں عام ناراضی پھیلی چنانچہ اسی زمانہ میں عمر نامہ[1] ایک کتاب لکھی گئی، جس کے دیباچہ میں سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایرانیوں کے جھوٹے سچ قصے لکھ کر ملک میں مشہور کر دیئے، اس لئے یہ کتاب حضرت عمرؓ فاروق کے حالات میں لکھی گئی، کہ لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹ جائے،

چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو لکھ کر شاہنامہ میں اس کو منضم کر دیا تھا، اس لئے لوگ شاہنامہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے، فردوسی چونکہ معتوب شاہی تھا، اس لئے بھی اس کی تصنیف مقبول عام نہ ہو سکی ہوگی،

یہ سب تھا، لیکن نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ خراسان سے لے کر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی، تقریر و تحریر، تصنیف و تالیف، خلوت و جلوت کوچہ بازار، اس کی آواز باز گشت سے گونج اُٹھے، لوگ جب کام سے فارغ ہو کر بیٹھتے تو کوئی خوش لہجہ شخص حفظ شاہنامہ کے اشعار پڑھتا، اور شجاعت و جانبازی، دلیری، حب وطن کا اثر تمام مجلس پر چھا جاتا،

سیکڑوں برس تک، سلاطین و امراء کی باہمی خط و کتابت میں شاہنامہ کے اشعار جابجا درج ہوتے تھے اور دلیری اور بہادری کے موقعہ پر بےساختہ اس کے اشعار زبان سے نکل جاتے تھے، میدان جنگ میں رجز کے بجائے شاہنامہ کے اشعار پڑھے جاتے تھے

---

[1] یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے ۱۲

سلجوقیوں کے اخیر فرماں روا طغرل ارسلان نے میدان جنگ میں لڑ کر جان دی تو شاہنامہ کے یہ اشعار زبان پر تھے،

من آں گرز یک زخم بر داشتم — سپہ را ہماں جائے بگذاشتم
چناں بر خروشیدم از پشت زیں — کہ چوں آسیا شد، پریشاں زمیں

شاہنامہ ہی کے اثر نے سیکڑوں برس تک، ایران کی شاعری کو غزل سے پاک رکھا، ابتدائی زمانہ سے جب اس کا اثر گھٹا اور عشق و عاشقی کے خیالات قوم میں پھیلنے لگے، تو فتنۂ تاتاریوں کے طوفان نے مسلمانوں کی خاک تک اڑا دی،

**شاہنامہ کی زبان** شاہنامہ کی زبان، آج کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ گویا دو زبانیں الگ الگ ہیں، اور یہ شاہنامہ کی تخصیص نہیں، اس زمانہ کے شعراء کی عام زبان یہی تھی، لیکن چونکہ اور کسی شاعر نے اسقدر الفاظ استعمال نہیں کئے اس لئے فردوسی کی زبان بہ نسبت اور شعراء کے زیادہ بیگانہ اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے،

شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ضمیروں کی ترکیب، مثلاً،

ع "ز شادی رخاں شاں چو گل بر دمید"

اب یوں کہیں گے رخ ہائے ایشاں،

۲۔ غیر جاندار چیزوں کی جمع الف و نون سے، مثلاً

اگر عمر باشد مرا سالیاں، یعنی سالہا،

۳۔ اسم اور فعل کے آخر میں الف زائد مثلاً

ع سیامک بر آمد برہنہ تنا، یعنی تن،

ع بر سی روز گیتی بپیمایدا

۴۔ فارسی زبان پر تشدید مثلاً خوشّی، زرّہ، پرّہ، ہمّ، ہرّہ، ترّ، تفتّ، کشّی،

۵۔ بعض زائد حرف، مثلاً چناں کے بجائے چونان، اشیا کے بجائے اشیواء چنیں کے بجائے چونیں، فرشتہ کے بجائے فریشتہ،

۶۔ در کے بجائے اندروں مثلاً

بہ جنگ اندروں گرزہ گاؤ رنگ،

۷۔ متحرک بجائے ساکن، اور ساکن بجائے متحرک، مثلاً۔

ع بگویم زمادر شں وہم از پدرش ع نیامدت از شیر وازدیو باک،

ع بہ شادی ہمہ جاں برافشاندند،

۸۔ بے کے پہلے الف زائد،

ع ابے او نباشیم در جنگ شاد،

۹۔ دیا بجائے یا،

دیا بارۂ رستم جنگجوے | بہ آخر نہ دبے خداوند روے،

۱۰۔ کجا بہ معنی کہ

ع در فشش کجا پیل پیکر بود،

۱۱۔ از بر بمعنی بر،

ع نشست اذ بر کوہ بہ ژندہ پیل، یعنی بر کوہ،

۱۲۔ ایچ بمعنی ہیچ،

ع زپیکاں نبود ایچ پیدا سرش،

۱۳۔ تائے خطاب کا استعمال، مثلاً

ع ہزارانت کودک وہم نوش لب یعنی ہزاراں ترا،

چرا آئی خیاں کت مراد وہوا است، یعنی کہ ترا

۱۴۔ ورا بمعنی اورا،

چو رستم ورا دید خیرہ بماند، یعنی رستم اورا دید،

۱۵۔ ازدۂ کے بجائے ازدی،

برادر آمدہ برسید از روے، | بدو گفت گستاخ با من بگوی

۱۶۔ ازیرا بجائے ازیں رو،

ع ازیرا سرت زآسماں برتر است، یعنی ازیں رو،

۱۷۔ آزمائش کے بجائے آزموں،

نہادی بر دست را آزموں | شکم بر زمیں بر نہادی ہیوں،

۱۸۔ میم متکلم کا حذف،

اگر من نہ رفتے بہ ماژندراں — یعنی اگر من نہ رفتے،

ان تصرفات کے علاوہ سیکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہیں، یا ان کی صورتیں بدل گئیں، یا ان کے بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں، مختصراً چند الفاظ ذیل میں درج ہیں،

| لفظ | معنی | لفظ | معنی | لفظ | معنی | لفظ | معنی |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ویژه | خاص | بادسر | مغرور | شخودن | خراشیدن | دستوار | عصا |
| مر | شمار | بارگی و باره | اسپ | شکردن | پاره کردن | دفتر شکستن | دفتر ساختن |
| ایدوں | حالا | باژ | خراج | غرم | میش کوہی | دمدار | ساقہ لشکر |
| ایدر | اینجا | بخش | حصہ | غرچہ | مخنث و نامرد | دواج | لحاف |
| آبخور | اصطبل | برتر | بلندی | غو | خروش | دیدار | چشم و رخ دیدار گفتن |
| آذین | زینت و آرائش | بسنده | کافی | گو | پہلوان | رده | صف |
| تال و مال | ریزہ ریزہ | بسیچ | قصد و کار سازی | فرو ریختن از اسپ | فرود آمدن | رزمہ | بقچہ |
| تخش | تیر | بگماز | شراب | فرودی | فضیلت و بزرگی | رستہ | صف زدہ |
| ترک | کلاہ آہنی | پازہر | تریاک | فسیله | گلہ اسپ | رفت آوری | آمد و رفت |
| ترنگ | صدائے کماں | پذیره | استقبال کردن | فش | دم و یال اسپ | رنج | رنگ |
| تلاش | پراگندہ | پدرام | آراستہ | فاروره | [illegible] | روزبان | دربان |
| تنگ آمدن | نزدیک آمدن | پہلوانی | زبان پہلوی | خشت | نیزه کوچک | روزسپی | فاحشہ |
| آذرگشسپ | برق | جوالی | [illegible] | در | دره کوه و سر قبر | دبوس | گرز |
| آستی | آستین | چاک | سفیده صبح | [illegible] | [illegible] | ورغ | پیراہن زوال |
| برسان | بسان | چاک چاک | صدائے زدن شمشیر | درخت | [illegible] | سبز و رسبز | نام بکسے سبقت |
| آغاز | ارادہ | چرنگیدن | آواز گرز | درقہ | سپر چرمین | ستادہ | خیمہ |
| افسوس | ظلم و ستم | چپ | [illegible] | دستار | دستر خوان | ستارہ | مسہری |
| اند | چند یا اندک | سہ دیگر | سیوم | دستینہ | [illegible] | ستودان | دخمہ |
| اندخور | لائق | شارسان | شہر و شہرستان | دست جامہ | جامہ سرتاپا | ستیخ | راست و بلند |
| انوشہ | آفرین | شبگیر | صبح | راست دست | وزیر اعظم | سرسری | فرومایہ |

| لفظ | معنی | لفظ | معنی | لفظ | معنی | لفظ | معنی |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| سمرون | شاخ گاؤ | ریدک | غلام و امرد تازہ | مہت | سنگین و گراں | گردگاہ | تہی گاہ و کمر |
| سفت | دوش | ریمن | مکار | ناپاک | بے باک | گردگاہ | مرموان |
| شیب | دنبالۂ تازیانہ | زحیر | پیچ و تاب | رلخ | صف لشکر | گریغ | گریز |
| ماروچ | گنج | زخم | عمارت | نوز | ہنوز | گشن | بسیار |
| صلاب | اسطرلاب | زمزم | کلماتے کہ مغاں وقت | نیو | پہلوان | ماہار | مہار شتر |
| طبرخون | بید سرخ | | پرستش گویند | زان | نگہبان | مزیح | طعنہ و ظرافت |
| طغرل | نوع از مرغ شکاری | زمی | زمیں | دیر | یاوہ فہم | منجوق | ماہیچہ علم |
| قرطہ | گرسنہ | زنہار خوردن | عہد شکستن | کماک | کمان | ولیہ | نعرہ |
| کاتوزی | زاہد | زوار | غلام زندان خانہ | کنانگ | بزرگ قوم | ہرکارہ | دیگ سنگی |
| کالوشہ | دیگچہ | ژکیدن | آہستہ زیر لب گفتن | کند آور | پہلوان | ہزمان | ہر زمان |
| کشکین | نان جوین | سمان | عرق لشکر | کوہسر | کوہسار | ہمانند | مانند |
| کفج | آب دہن | ہمونفس | جان | بشک | چپانندگان پشمین | | جانور درندہ |

# اسدی طوسی

اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے، صاحب آتشکدہ نے اسکو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے،

اسدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابونصر ہے، سلسلۂ نسب شاہان عجم سے ملتا ہے، تحصیل علوم کے بعد عراق کا سفر کیا، اور دیلمیوں کے دربار میں رسائی حاصل کی، عراق سے آذربایجان آیا، یہاں کا رئیس ابودلف کرکری تھا، اس کا وزیر نہایت قدردان علم و فن تھا، اس نے اسدی سے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا، تم اسی کے ہموطن اور ہم فن ہو تم بھی کچھ یادگار چھوڑ جاؤ، اسدی نے گرشاسپ نامہ لکھ کر ہم فنی کا حق ادا کیا، چنانچہ ان تمام واقعات کو خود دیباچہ میں لکھا ہے،

یکے بود سردار دنیا و دیں — گراں مایہ دستور شاہ زمیں
بمن گفت فردوسی پاک مغز — بداد است داد سخنہاے نغز

بہ شہنامہ گیتی بیار است است | وزاں نامہ نام نکو خواست ہست
تو ہم شہری او را و ہم پیشۂ | چو او در سخن چابک اندیشۂ
ازاں ہمرہاں نامۂ پاستاں | بہ نظم آر خرم یکے داستاں

دولت شاہ نے لکھا ہے، اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی تقلید کی ہے کہ فردوسی جب غزنیں سے بھاگ کر مختلف شہروں سے گذرتا ہوا، وطن میں آیا، اور زندگی کے دن قریب آگئے تو اسدی کو بلا کر کہا کہ شاہنامہ کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے میرے بعد کون اس کو پورا کر سکے گا، اسدی نے کہا، جان اُستاد! کچھ اندیشہ کی بات نہیں، میں اس خدمت کو انجام دوں گا، چنانچہ ایک رات دن میں چار ہزار شعر لکھ کر فردوسی کو سُنائے فردوسی نہایت خوش ہُوا اور وہ اشعار شاہنامہ میں داخل کر لئے، یہ وہ اشعار ہیں جہاں عربوں کے حملہ اور ایران کی شکست کا ذکر ہے

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے، نہ شاہنامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا اُستاد تھا، نہ فردوسی، اسدی سے ایسی فرمایش کر سکتا تھا، نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ اسدی کے انداز سے ان اشعار کو مطلقاً مناسبت نہیں،

شاعری پر اسدی کا ایک احسان یہ ہے کہ قصائد میں جدت کا راستہ نکالا، اکثر قصائد میں مناظرات لکھے ہیں، اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے وہ دو چیزوں کو لے کر باہم مناظرہ کراتا ہے ہر ایک کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتا ہے، بالآخر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز کرتا ہے چنانچہ رات دن، زمین آسمان، گبر و مسلم، قوس و رمح، شب و روز کا مناظرہ، مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے،

اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحاتِ فارسی پر کتاب لکھی، چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے، سلگمین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[2]

کلام پر رائے | اسدی اگرچہ فردوسی وغیرہ کا معصر ہے، لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے

---

[1] اسدی نے گرشاسپ نامہ میں فردوسی کا نام جس طرح لیا ہے، اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی اس کا شاگرد نہ تھا، یہ شعر ملاحظہ ہو۔ بہ شہنامہ فردوسی نغز گوے | کہ از پیش گویندگاں برد گوے

[2] مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم تذکرہ اسدی،

لحاظ سے، نظامی سے دوش بدوش ہے، ایک جنگل کی تعریف میں لکھتا ہے۔

چناں تنگ در ہم یکے بیشہ بود — کہ رفتن دراں کار اندیشہ بود
اس طرح کا گھنا جنگل تھا — کہ اس میں صرف خیال چل سکتا تھا
درختان سر در کشیدہ بسر — چو خطِ دبیراں یکے اندر دگر
اس کے درخت اس طرح پاس پاس تھے — جس طرح خوشنویسوں کی سطریں ہوتی ہیں
ہمہ شاخہا تا بچرخِ کبود — بہم در شدہ تنگ چوں تار و پود
تمام شاخیں آسمان تک — اسطرح لپٹی ہوتی تھیں جیسے کپڑے میں تانا بانا ہوتا ہے
تو گفتی سپاہیست در جنگ سخت — زرہ ہست گردوگرہ ہر درخت
یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لڑائی میں مصروف ہے — ہر درخت پہلوان ہے
کماں شاخہا شاں، ہمہ گرزبار — سپر برگہا و سناں نوک خار
شاخیں کمان تھیں، گرز پھل تھے — پتے سپر، اور کانٹے برچھیاں تھیں
نتابندہ اندروے از چرخ ہور — ز تنگی رہش پوست رفتے ز مور
آفتاب کبھی اس میں چمکا نہیں تھا — اسقدر گنجان تھا کہ چیونٹی اسمیں چلتی تو اسکی کھال اُتر جاتی

اس قسم کی تشبیہات اور اس قسم کا مبالغہ، متوسطین بلکہ متاخرین کا انداز ہے، با اینہمہ واقعہ نگاری اور صورتِ حال کے منظر دکھانے میں اسدی کو فردوسی سے کم مایہ نہیں کہہ سکتے، گرشاسپ نے جہاں اژدہا کو مارا ہے، اس موقع پر اژدہا کی تصویر دیکھو کس طرح کھینچی ہے، اگلے زمانہ میں اژدہا کی تصویر جو لوگوں کے ذہن میں تھی یہ تھی کہ بیس تیس گز لمبا ہوتا ہے، آگے دو بڑے بڑے دانت ہاتھی کی طرح نکلے ہوتے ہیں، سانس لیتا ہے تو منہ سے شعلے نکلتے ہیں۔ سر پر کانٹے کی طرح بال ہوتے ہیں جسم پر ہاتھی کے کان کے برابر چھتے ہوتے ہیں، جن کو کبھی سمیٹ لیتا ہے اور کبھی پھیلا دیتا ہے، آنکھیں ستارہ کی طرح دور سے چمکتی ہیں،

شد اندر درع ہر سوے بنگرید — بناگاہ آں اژدر آمد پدید
براں پشتہ او، سیہ سایاں مکین — ز پیچیدنش جنبش اندر زمیں
چو تاریک غارے دہن کردہ باز — دو نیشش چو شاخ گوزناں دراز
دہان و نفس دود و آتش بہم — دہانش کورۂ آہن و شعلہ دم
ز تفِ دہانش دل خارہ موم — ز زہرِ دمش بادِ گیتی سموم

بہ دو و نفس ہر دو چشمش ز نور — درخشاں چو در شب ستارہ ز دور
گرہ در گرہ خم و دم تا بہ پشت — ہمہ سرش چوں ز موہا درشت
بشیزہ بشیزہ تن از زخم نیل — اناں ہر بشیزہ ہمہ از گوش فیل
گہے چوں سپر بر فگندیش باز — گہے ہمچو جوشن کشیدی دراز
چو بر کوہ سودے، تن تنگ رنگ — بفرسنگ رفتے چکاکاک سنگ

غرض شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بیچ کی کڑی گرشاسپ نامہ ہے، نظامی نے غالباً گرشاسپ نامہ کو سامنے رکھ کر سکندر نامہ لکھتا ہے۔

# منوچہری

دامغان وطن، ابو النجم کنیت، احمد نام، شصت کلہ لقب اور منوچہری تخلص تھا، دولت شاہ نے اس کو بھی لکھا ہے، چونکہ نہایت دولتمند تھا، اس لئے شصت کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، امیر منوچہری بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرمان روا تھا اور ۳۸۶ھ میں تخت نشین تھا، یہ اس کے دربار میں ملازم تھا، اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا، ۴۲۱ھ میں منوچہری نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا، اور عنصری کی مدح میں قصیدہ لکھا، جو اس کے دیوان میں موجود ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں

اوستاد اوستادان زمانہ عنصری — عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع — طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن
تو جریر و تو فرزدق تو ولید و تو لبید — روبہ و عجاج و دیگر انجمن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند — تا عزیزی رہ بشنہ ببینند و طبیعی نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او — ہرچہ در فردوس مارا وعدہ کردہ ذو المنن
کثرت الفاظ عذب او و معنی سلسبیل — لفظ او انہار خمر و نقش او انہار لبن

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی، لیکن یہ بھی خوشامد کا ایک پہلو تھا، جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے، بہر حال عنصری نے اس دربار شاہی میں پہنچایا، اور سلطان محمد بن محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا، یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا، کچھ روک ٹوک نہ تھی، محمد چند روز کی سلطنت کے بعد

یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا، اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس کیا، منوچہری کے اکثر قصائد مسعود ہی کی مدح میں ہیں، مسعود بھی اس کا نہایت قدردان تھا، یہاں تک کہ دربار کے شعراء اس پر رشک کرتے تھے، ایک قصیدہ میں منوچہری نے فخر کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، تقی کاشی نے خلاصۃ الافکار میں لکھا ہے۔ کہ منوچہری، عنصری و عسجدی کا ہمعصر تھا، اور دربار میں عنصری کے سوا اور تمام شعراء یہاں تک کہ فردوسی اور فرخی تک اس سے نیچے بیٹھتے تھے لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس لئے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا تھا،

منوچہری فطرۃً شاعر تھا، نہایت کمسنی میں لوگ مشکل طرحیں دیتے تھے، اور وہ برجستہ ان طرحوں میں قصیدے اور غزل کہتا تھا،

دیوان جو آج موجود ہے، اس میں تین ہزار شعر ہیں، علی قلی خاں ہدایت نے بڑی تلاش سے بہم پہنچایا اور شائع کیا، فرانس میں اس کا دیوان نہایت اہتمام اور تکلف سے چھپا ہے، فرہنگ بھی ہے اور تمام مشکل اشعار کو حل کیا ہے، یہ نسخہ میری نظر سے گزرا ہے، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، منوچہری نے ۴۳۲ھ میں انتقال کیا،

**کلام کی خصوصیت** | منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اس کے معاصروں کا کلام بالکل خالی، بلکہ مابعد کے شعراء میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں،

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے، اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں، ابوالشیص کا ایک قصیدہ ہے،

| | |
|---|---|
| سقاک واللیل ملتقی الحدثان | غراب ینوح علی غصن بان |

منوچہری اس کے جواب میں لکھتا ہے،

| | |
|---|---|
| جہانا چہ بدمہر و بدخو جہانی | چو آشفتہ بازار بازارگانی |

مزہ وہاں آتا ہے، جہاں چند شعرائے عرب کے نام لے کر کہتا ہے کہ فلاں شاعر نے خلیفہ اور امیر کی مدح میں نذر کے قصیدے لکھے اور ایسے بڑے بڑے صلے حاصل کئے ہیں میں بھی اسی طرح تیرے دربار میں آتا ہوں،

| | |
|---|---|
| شنیدم کہ اعشیٰ بہ شہر یمن شد | سوے سودۃ بن علی الیمانی |

بروخواند شعرے بالفاظ تازی | بہ شیریں معانی و شیریں زبانی
یکے کارواں اُشترگشن وادش | ہر اُشتر لبان گہے از کلانی
سوے تاج عمرانیاں ہم بدینساں | بیاید منوچہر گوئد امغانی

دیکھو تخلص کس لطف سے کھپایا ہے،

آخر میں تصریح کی ہے کہ یہ قصیدہ میں نے ابوالشیص کے جواب میں لکھا ہے، ساتھ ہی قصیدہ کا مطلع بھی تضمین کیا ہے،

بداں وزن ایں شعر گفتم کہ گفتہ است | ابوالشیص اعرابی باستانی
سالقالک والليل ملقی الجران | غراب ینوح علی غصن بان

ابن المعتز کا ساوات علوی کے معارضہ میں ہے،

ونحن بنوا العم اولی بہا،

اس قصیدہ پر منوچہری نے قصیدہ لکھا ہے، اور لطف یہ کیا ہے کہ عربی ضمیر کی جو ھتی اس سے فارسی میں جمع کا کام لیا ہے،

چراز زلف شب باز شد تا بہا | فرو مرد قندیل محرا بہا،
سپیدہ دم از بیم سرمائے سخت | بپوشید برکوہ سنجاب ہا
بمیخوارگاں ساقی آواز داد | فگندہ بزلف اندروں تابہا
بیا تا گہ تختیں ازیں خواب خوش | بجستیم ما مجہ طبطاب ہا
منجم ببام آمد از نور مے | گرفت ارتفاع سطرلاب ہا

فارسی کے اور شعرا کے برخلاف منوچہری کو شعرائے عرب کے اکثر دیوان حفظ یاد تھے، اور اس پر فخر کرتا تھا، ایک قصیدہ میں حاسد کو خطاب کرکے لکھتا ہے،

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر | تو ندانی خاند الاھبی بصحنک فاصبحین
یعنی مجھکو عرب کے بیسیوں دیوان ازبر ہیں | اور سبعہ معلقہ کا یہ قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا
الا ھبی بصحنک فاصبحینا | ولا تبقی خمور الاندرینا

عربی پر اس کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے کلام میں عربی قصائد کی طرف اشارے کرتا ہے اور ان کے وہ ٹکڑے جن کے نام سے وہ قصیدے مشہور ہیں، بے تکلف تضمین کرتا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

امراء القیس و لبید و حنظل و اعشیٰ و قیس | بر طلل ہا نوحہ کردند ے و بر رسم تلی ہا
شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد | جعفر و سعد و سعید و سید ام القری
آنکہ گفتست اذ نتنا آنکہ گفت الا ھبی | آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت ابلی الھوی

اس شعر میں چار قصیدوں کے مطلعوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی

اذنتنا بینہا الا سماء — (سبعہ معلقہ کا قصیدہ ہے)

الا ھبی بصحنک فاصبحینا — سبعہ معلقہ

السیف اصدق انباءً من الکتب — ابو تمام کا مشہور قصیدہ ہے جو معتصم کی مدح میں جمہوریہ کی فتح کی تقریب پر لکھا گیا تھا

ابلی الھوی، (متنبی کا قصیدہ ہے)

اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں۔ یہاں تک کہ محض فارسی داں اس کے کلام سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتے، ایک قصیدہ کا مطلع ہے!

فرو زبر نگاشت بصحرا و مشک مے | تمثال ہائے عزہ و تصویر ہائے مے

عرب میں لیلےٰ و شیریں کے بجائے جن معشوقوں کا نام آتا ہے "لیلےٰ، اسمی، رباب، عزۃ، میہ، تقبیہ وغیرہ ہیں، عزۃ، کثیر کی معشوق تھی، جو بنی امیہ کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا، میہ ذوالرمہ کی معشوق تھی، اسی میۃ کو منوچہری نے قافیہ کی ضرورت سے مے کہہ دیا ہے،

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے،

باد بزین صناعت مانی کند ہمے | مرغ حزیں روایت معبد کند ہمے

معبد جو امیۃ کے زمانہ کا مشہور مغنی تھا،

روایت کردن کے معنی گانے کے ہیں، مرغ حزیں سے بلبل مراد ہے، یعنی بلبل معبد کے راگ گاتی ہے،

زمیں محراب او دست دلبس سبزہ پنداری | گشادہ مرغکاں بر شاخ چوں داؤد حنجرہا
ہا نظم ابن رومی و با نثر اصمعی، | با شرح ابن جنی و با و با نحو سیبوے،
آں جایگاہ کا تخمن سر کشاں بود، | تو بو فلانی آں دگراں ابنہ دبنی

(۲) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی، روانی اور شستگی ہے، یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے، لیکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہو گئی ہیں، جن سے اور زیادہ شیرینی

اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہے، کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہے، اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات[۱] کی صنعت میں لکھتا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے چلے آتے ہیں،

ماہ رمضاں رفت و مرا زفتن آں بہ ‎ ‎ عید رمضاں آمد والمنۃ اللہ
برآمدن عید و بروں رفتن روزہ ‎ ‎ ساقی بدہم بادہ بر باغ و بہ سبزہ
بر نہ بکف وستم آں جام چو کوثر ‎ ‎ جام دگر آر و بکف دست دگر نہ
من می نخورم تا نبود بر دو کفم جام ‎ ‎ یا ساتگینی بر سر خوانم نہ ہی مسہ
چوں می بدہی نوش ہمی گوئی و ہمی باش ‎ ‎ چوں می نخورم جام ہمی گیر دہمی چہ
دلم اے دوست تو دانی کہ ہوائے تو کند ‎ ‎ لب من خدمت خاک کف پائے تو کند
چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی ‎ ‎ تا چو تو چاکر تو تیر دعائے تو کند
از لطیفی کہ توئی اے بت و از شیرینی ‎ ‎ ملک مشرق ہمہ راست کہ رائے تو کند
ایں جہاں کرد برائے تو خداوند جہاں ‎ ‎ واں جہان نیز برانم کہ برائے تو کند
صنما از تو دلم ہیچ شکیبا نہ شود ‎ ‎ اگر امروز شود بیشک فردا نہ شود
تجربت کردم و دانا شدم از کار تو من ‎ ‎ تا مجرب نہ شود، مردم دانا نہ شود
نہ کشم ناز ترا و نہ دہم دل بہ تو ہم ‎ ‎ تا مرا آشتی و مہر تو پیدا نہ شود
گوئی از دو لب من بوسہ تقاضا چہ کنی ‎ ‎ دلم خواہی نبود کہ بہ تقاضا نشود
بہ مدارا دل تو نرم کنم، و آخر کار ‎ ‎ بدرم نرم کنم گر بہ مدارا نہ شود
وگر ایں عاشق نومید شود از در تو ‎ ‎ از در خسرو شہنشاہ دنیا نہ شود
صنما گرد سرم چند ہمے گردانی ‎ ‎ زشتی از دو سے نکو زشت بود گردانی
یا مکن آنکہ شب و روز ہمی وعدہ دہی ‎ ‎ یا مکن وعدہ ہر آں چیز کہ می نتوانی
دل من بردی و از خویشتنم دور کنی ‎ ‎ بر نیاید صنما! کار بدیں آسانی
مہربانی نہ کنی بر من و جہرم طلبی ‎ ‎ نہ دہی داد من و داد ز من بستانی
بیوفائی کنی و نادانی سازی تن خویش ‎ ‎ نیستی اے بت یکبار و بدیں نادانی

---

۱ تنسیق الصفات کی مثال گھوڑے کی تعریف میں آئے گی،

ازتو بارانہ گنارہ پیام ونہ سلام　　　لکن اے دوست، کہ کیفر بری ودانی

لکن اے دوست کہ بیداد نقاہی نگذاشت

عدل باز آمدہ بابو الحسن عمرانی

نوروز روزگار نشاط است ایمنی　　　پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی

خیل بہار خیمہ بصحرا برون زند　　　واجب کند کہ خیمہ بصحرا برون زنی

برگل ہمی نشینی و برگل ہمیخوری　　　برخم ہمی خرامی و بر دن[1] ہمی زنی

درست ناخریدہ وخشک ست آرائیگل　　　ہر چند بر نشانی و ہر چند برچنی

شاخ بنفشہ بر سر زانو نہادہ سر　　　مانندہ مخالف بوسہل زوزنی

باد نوروزی ہمی در بوستان ساحر شود　　　تا بسحرش دیدۂ ہر گلبنے ناظر شود

باز ہمچو زرگرو ہر سوے دیبا طے　　　بوستاں آراستہ چوں کلبۂ تاجر شود

نوبہار ار این جامۂ صد رنگ بسشتہ اگر　　　دو شمار دوستاں خواجہ بدو ظاہر شود

منوچہری مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہے، صحرا، سبزہ، بادل، سیلاب، ہوا وغیرہ وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں اور اس خوبی سے لکھے ہیں، کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائیگا۔

ایک قصیدہ میں سفر کا حال لکھتے لکھتے آب ہوا کے طوفان کا حال لکھا ہے، اس موقع پر ہوا کے جھونکے، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، پانی کے سیلاب کا نقشہ دیکھو کس طرح کھینچا ہے،

برآمد بادے از اقصائے بابل　　　ہبوبش خارہ در و پارہ افگن

تو گفتی کز ستیغ کوہ سیلی (چوٹی)　　　فرو بارد ہمے احجار صد من

ز روئے بادیہ برخاست گردے　　　کہ گیتی کرد ہمچوں رخنہ ادکن

چناں کز روئے دریا بامداداں　　　بخار آب خیزد ماہ بہمن

برآمد زاغ رنگ و ماہ پیکر　　　یکے میغ از ستیغ کوہ قارن

چناں چوں صد ہزاراں خرمن تر　　　کہ عمدا در زنی آتش بخرمن

بجستے ہر زماں از تیغ برقی　　　کہ کردے گیتی تاریک روشن

خروشی برکشیدے تند تندر　　　کہ موئے مرداں کردے چو سوزن

---

[1] دن یعنی خم شراب ونی، ونیدن سے مشتق ہے جس کے معنے اکڑ کر چلنے کے ہیں،

تو گفتی نائے رومی ہر زمانے — بگوشش اندر دمیدے یک دمیدن
بلرزیدے زمیں از زلزلہ سخت — کہ کوہ اندر زرنج پشگاں تن
تو گفتی ہر زمانے زندہ پیلے — بلرزاند زرنج پشگاں تن
فرو بارید بارانے ز گردوں — چناں چوں برگ گل بارد ز گلشن
دیا اندر تموزی مہ ببارد — جہاد منتشر بر بام و برزن
ز صحرا سیلہا برخاست ہر سو — دراز آہنگ و پیچاں و زمیں کن
چو ہنگام عزائم زی معزم — بتک خیزند ثعباناں ز ریمن
نماز شامگاہاں گشت صافی — زدودے آسماں ابر معکن

بہار کی تعریف شعرائے ایران کا ایک عام موضوع ہے جس پر ابتدا سے آج تک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں، لیکن قدماء اور متاخرین میں سے کسی نے منوچہری کی طرح نیچر کی تصویر نہیں کھینچی، اس نے سینکڑوں جگہ بہار کا نقشہ دکھایا ہے، اور ہر جگہ گویا فطرت کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے، وہ اور شعرا کی طرح صرف گل و بلبل پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایک پتے، پھول پھل، شاخ، درخت، اور ان سب سے بڑھ کر جانوروں اور پرندوں کی صورت اور حالت دکھاتا ہے،

پرندوں کی حالت،

کبکان بے آنکہ بر کوہ بلند اند — بے قہقہہ یکبار ندیدم کہ بخندید
جز خار بناں[1] جایگہ خود نہ پسندند — بر پہلو ازیں خیمہ بداں خیمہ بدوند[2]
ہر ساختگی سینہ بمنقار بر ندند،
چوں جزع[3] بر سینہ و چوں بسد[4] منقار
شب گیر ز گل فاختگاں بانگ بر آرند — گوئی کہ سحرگاہ ہمی خواب گزارند
ماہ (ہلال) سہ شبہ از بر گردن بنگارند — از غالیہ بے آنکہ ہمی غالیہ دارند
صد بار بروزی در پرہا بشمارند[5]
چوں نیم و بیرمی کہ غلط کردہ اشمار[6]

۱ خار بناں، خار دار، ۲ بوند، میغرامند، ۳ جزع مہرہ سلیمانی کہ سفید و سیاہ باشد، ۴ بسد، یاقوت، ۵ کہتا ہے کہ قمریاں اس طرح بار بار اپنے پروں کو گنتی ہیں، دیکھتی ہیں، جس طرح کہ نوآموز حساب داں بار بار حساب بھول جاتا ہے اور پھر کاغذ کو الٹتا ہے۔ ۶ اشمار، شمار،

هر ساعتکی دبط سخنے چند بگوید ‌ ‌ ‌ در آب جهد جامه دگر بار بشوید
در آب کند گردن و در آب بروید ‌ ‌ ‌ گوئی که مگر چیزے در آب بجوید
چوں سینه بجنباند و یک لخت بپوید
از مهر سر پرش بجهد صد دُر شهوار

---

آمد نوروز دهم از بامداد ‌ ‌ ‌ آمدنش فرّخ و فرخنده باد
باز جهاں خورم و خوب ایستاد ‌ ‌ ‌ مرد زمستاں و بهاراں بزاد
ز ابر سیه روے سمن بوے دار
گیتی گردید چو دار القرار

روے گُل سُرخ بیاراستند ‌ ‌ ‌ زلفکِ شمشاد بپیراستند
کبکاں بر کوه بتک خواستند ‌ ‌ ‌ فاختگاں همبر بنشاستند
بلبلکاں زیر ستا خواستند،
نالے زناں بر سرِ شاخ [زیر و بم] چنار،

طوطیاں بر گلکاں تاختند ‌ ‌ ‌ آهوکاں گوش برافراختند
گورخراں میمنها ساختند ‌ ‌ ‌ زاغان گلزار بپرداختند
بے دلکاں در پے دل تاختند
با ترکاں [عاشق] چگل و قندهار

مُرغ نه بینی که چه خواند همے ‌ ‌ ‌ میغ نه بینی چه ستاند همے
دشت نه بینی بچه ماند همے ‌ ‌ ‌ دوست نه بینی چه نشاند همے
باغ بُتاں زبنشاند همے
بر سمن و نسترن و لاله زار

---

کرده گلو پُر ز باد قمری سنجاب پوش ‌ ‌ ‌ کبک فرو ریخته مشک بسوراخ گوش
بلبکاں با نشاط قمریکاں با خروش ‌ ‌ ‌ در دهن لاله مشک در دهن نحل نوش
سوسن کافور بوی گلبُن گوهر فروش
از مه اردی بهشت ُهر بهشت برین

چوک ز شاخ درخت خویشتن آویخته — زاغ سیه بر دو بال غالیه آمیخته
(نام مرغے است)
ابر بہاری ز دور اسپ بر انگیخته — وز سم اسپ سیاه لولوی تر ریخته

در دہن لالہ باد ریخته و بیخته
ریخته مشک سیاه بیخته در ثمین

سرو سماطی کشید بر دو لب جویبار — چوں دو رہ چتر سبز در دو صف کارزار
مرغ نہاد آشیاں بر سر شاخ چنار — چوں سپر خیزراں بر سر مرد سوار

گشت نگارین تذرو پنہاں در کشت زار
ہمچو عروسی غریق در بن دریاے چیں

گوئی بط سفید جامہ بصابوں زده است — کبک دری ساق پاے در قدح خوں زده است
بر گل تر عندلیب گنج فریدوں زده است — لشکر چین در بہار در کہ ہاموں زده است

لالہ سوے جویبار خرگہ بیروں زده است
خرگه او سبز گوں خیمہ او آتشین؛

بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہے، کبھی ننھی ننھی پھوار پڑتی ہے، کبھی جھڑی لگ جاتی ہے، سبزہ پر، مختلف قسم کے پھولوں پر، تالاب کی سطح پر، بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہوکر ہر ایک کا الگ الگ سماں نظر آتا ہے۔

منوچہری نے ایک موقع پر تشبیہات کے پیرایہ میں اس کی تصویر کھینچی ہے،

آں قطرهٔ باراں بیں از ابر چکیده — گشته سر برگ از آں قطره بہ آثار
آویخته چوں ریشهٔ دستارچهٔ سبز — سیمیں گرہے بر سر ہر ریشهٔ دستار
یا ہمچو زبر جد گوں یک دستہ سوسن — اندر سر ہر سوزن یک لولوی شہوار
واں قطرهٔ باراں کہ فرو بارد شبگیر — بر طرف چمن بر دو رخ سرخ گلنار
گوئی بہ مثل بیضهٔ کافور ریاحی (صبح) — بر برگ گل احمر ہمہ پراگندش عطار
واں قطرهٔ باراں کہ فرود آید از شاخ — بر تازه بنفشہ نہ بہ تعجیل بہ اوزار
گوئی کہ مشاطہ ز بر فرق عروساں — با ورد ہمے بیزد بار یک بمقدار (آہستہ آہستہ) (گلاب)
واں قطرهٔ باراں کہ چکد از بر لالہ — گرد طرف لالہ از آں باراں بنگار
پنداری تبخالهٔ خردک بدمیده است (آبلہ) — بر گرد عقیقیں دو لب دلبر عیار

واں قطرۂ باراں کہ برافتد بر سر خوید — چوں قطرۂ سیماب برافتادہ بہ زنگار
واں دائرہ ہا بنگر اندر شمر آب — ہر گہ کہ دراں آب چکد قطرۂ امطار
چوں مرکز پرکار است آں قطرۂ باراں — واں دائرۂ آب بساں خط پرکار
ہر گہ کہ ازاں دائرہ انگیزد باراں — وز باد درو چین و شکن خیزد و ہر بار
گوئی علمی از سقلاطون سپید است — وز باد وجہندہ متحرک شدہ بسیار
(اطلس)
واں گاہ کہ فرو بارد باران بہ قوت — گیرد شکن آب دگر صورت و آثار
گرد و شمر آید وں چو یکے دام کبوتر — دیدار ز یک حلقہ شے ہمیں منقار
(یعنی قطرہ آتا ہے)

سراپا نگاری — حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری اس کا گویا موجد ہے، قصائد میں شعرا بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کرتے ہیں، عبدالواسع جبلی اور عرفی شیرازی اس میدان میں سب سے آگے ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں، بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے، اور وہاں اس کی قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے، کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار لگاتا چلا جاتا ہے،

گھوڑا
حبذا اسپے محجل مرکبے تازی نژاد — نعل او مہ وی نشان و سم او خارہ شکن
(گھوڑا)
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام — شخ نورد و وارہ جوی و سیل برد و کوہ کن
(خوش خرام) (زین سخت)
پشت او ی دست اوی گوش اوی گردنش — چوں کمان و چوں ملح و چوں سناں چوں مجن
گاہش اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز — چوں کسی کو گاہ بازی بر فشیند بر رسن
(سپہر)

---

دیر خواب و زود خیز و تیز سیر و دور بیں — خوش عنان و کش خرام و پاک زاد و نیک خوی
سخت پاپے و ضخم ران و راست دست و گرد سم — تیز گوش و پہن پشت و نرم چرم و خورد موی
ابر سیر و باد گرد و رعد بانگ و برق جہ — کوہ کوب و سیل بر و شخ نورد و وارہ جوی
گور ساق و شیر زہرہ یوز تاز و عزم تگ — پیل گام و گرگ سینہ رنگ تاز و گرگ پوی
تیز چشم آہن جگر فولاد دل کم بخت لب (سبز گوں) — سیم دنداں پیاہ مینی نادہ کام و لوح روی
نیزہ و گرز و کمند و ناچخ و تیر و کمان — گردن و گوش و دم و سم و دہن و ساق اوی

---

برجہد بادگذر، یوزدو، وکوہ قرار — شیر تگ، پیل قدم، گوررو، آہو پرتاز
گوش و پہلو و میان و کتف و جبہہ و ساق — تیز و فربہ و نزار و قوی و پہن و دراز
رہ برو شخ شکن و شیر دل و ببر عناں — خوش دو و سخت سم و پاک تن و جنگ آغاز

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا، لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈ لیتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلسل داستان لکھ رہا ہے، ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا، بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیش نظر رکھتا ہے، ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت اور سفر کے حالات لکھے ہیں،

الا یا خیمگی خیمہ فروہل — کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
تبیرہ زن بزد طبل نخستیں — شتربانان ہمے بندند محمل
نماز شام نزدیک است امشب — مہ و خورشید را بینم مقابل
ولیکن ماہ دارد قصد بالا — فرو شد آفتاب از کوہ بابل
چناں دو کفۂ زریں ترازو — کہ ایں کفہ شود زاں کفہ مائل
نگار من چو حال من چناں دید — ببارید از مژہ باران وابل
بیامد او فتاں خیزاں بر من — چو آں مرغے کہ باشد نیم بسمل
دو ساعد را حمائل کرد بر من — فرو آویخت از من چوں حمائل
چو برگشت از من آں معشوق ممشوق — نہادم صابری را سنگ بر دل
نگہ کردم بہ گرد کارواں گاہ — بجائے خیمہ و جائے رواحل
نہ وحشی دیدم آنجا و نہ انسے — نہ راکب دیدم آنجا و نہ راحل
نجیب خویش را دیدم بہ یکسو — چو دیوے دست و پا اندر سلاسل
کشادم ہر دو زانو بندش از بند — چو مرغے کش کشاید از حبائل
بر آوردم زمامش از بناگوش — فرو ہشتم ہویدش تا بہ کاہل
چو سیاحی کہ پیماید زمیں را — بہ پیمودم بپائے او مراحل
ہمی رفتم شتاباں در بیاباں — ہمے کردم بیک منزل دو منزل

ہمی بگداخت برف اندر بیاباں ۔۔۔ تو گوئی وا ز دشمن بیماری سل
چو پاے از شب نے پرندہ بگرشت ۔۔۔ بر آمد شتر کاں از کوہ موسل
رسیدم من فراز کارواں تینگ ۔۔۔ چو کشتی کو رسد نزدیک ساحل
جرس دستاں گوناگوں ہمی زد ۔۔۔ بسانِ عندلیب از عنادل
زنوک نیزہ ہاے نیزہ داراں ۔۔۔ شدہ وادی چو اطراف سنابل
نجیب خویش را گفتم سبکتر ۔۔۔ الا یا دستگیر مرد فاضل،
بجیر کت عنبریں بادا چراگاہ ۔۔۔ نہیم کت آہنیں بادا عفاصل
بیاباں در نورد و کوہ بگذار ۔۔۔ منازل را بکوب و راہ بگسل
فرود آور بدرگاہ وزیرم، ۔۔۔ فرود آوردن اعشی بر ماہل

عنبر کی تعریف

ہاتھی کی تعریف

اقسام سخن میں سے منوچہری کے مسمطات[۱] مشہور ہیں، وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

طاؤس ہزار عنصری خوار ۔۔۔ دراج مسمطِ منوچہری

اس مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کیے ہیں، ایک مسمط میں انگوروں کے چھلنے اور ان سے شراب کھینچنے کو ایک حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی انگور ایک عورت ہے، اس نے لڑکیاں جنی ہیں، انگور والا خوش ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہیں، اکثر آ آ کر دیکھتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، اتفاق سے اسے باہر جانا پڑا آ کر دیکھا تو بچوں کے سرخ سفید چہرے سیاہ ہو گئے ہیں، اور ان کے پیٹ نکل آئے ہیں، اس کو سخت رنج ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں، لڑکیوں نے عذر خواہی کی لیکن اس نے نہ مانا۔ اور ان کے گلے کاٹ ڈالے، اسی طرح شراب پینے کی اخیر حالت تک حکایت کے پیرایہ میں بیان کی ہے

شاخ انگور کہن دختر کاں زاد بسے ۔۔۔ کہ نہ از درد بنالید و نہ برزد نفسے
ہمہ را زد بیک شکم بیش و نہ پسے ۔۔۔ زو را قابلہ بود نہ فریاد رسے
این چنین آسان فرزند ندیدست کسے
کہ نہ درد بے بگرفتش متواتر نہ تپے

چون نگہ کرد برآن دختر کاں مادر پیر ۔۔۔ سر بود ندبیا یک چہ صغیر و چہ کبیر
کرد شاں مادر بستر ہمہ از عنبر بیہ ۔۔۔ نہ خورش داد مر آن بیگانہ را ہیچ نہ شیر

[۱] مسمط میں چھ مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پانچ مصرعوں کے قافیے متحد ہوتے ہیں،

نه شغب کردند آن بچگان نه هیچ نفیر
بچه گرسنه دیدی که ندارد شغبی

بچگانش بنهادند تن خویش بر آب
نه جهیدند و نه جستند از آن بستر خواب

گرد گردند سر پای محکم کردند نقاب
روی ها یکسر کردند به زنگار خضاب

دادشان ز زبان پیوسته شراب و جلاب
نشد از جانبشان غائب روز و نه شبی

گفت پندارم کین دختر گان من اند
چون دل و چون جگر و چون تن و چون جان من اند

تا بباشند درین خانه مهمان من اند
از فردوس من است ایشان خوان من اند

تا درین باغ و درین خان و درین دامان من اند
دارم اندر سرشان سبز کشیده شبی

در چو بگشاد بدان دختر کان کرد نگاه
دید چون زنگی هر یک را دو دیده سیاه

جای جای بچه تابان چو زهره و ماه
بچه سرخ چو خون و بچه زرد چو کاه

سر فگنده ز شرم و درو تیره ز گناه
هر یکی با شکم حامله و با نار لبی

رز بیچاره به دو ابروی در افتاده گره
گفت لا حول ولا قوة الا بالله

این بلای بچگان در حق من آمد زه
همه آبستن گشتند بیک شب که و مه

نیست یک تن بمیان همگان ایدر به
این چنین زانیه باشد بچه هر غلبی

دختران رز گویند که ما بی گنهیم
ما تن خویش بدست بنی آدم ندهیم

ما همه سر بسر آبستن خورشید و مهیم
ما همانیم که از خلق جهان دور رهیم

نتوانیم که از ماه و ستاره برهیم
ز آفتاب و مه مان سود ندارد هر بی

روز هر روز همی خورشید بتابد بر ما
خویشتن در فگند بر تن ما و سر ما

چون شب آید برود خورشید اختر ما
ماهتاب آید و بر جهد در پیکر ما

وین دو تن دور نگردند ز بام و در ما

نکند ہیچ کس ایں بے اوباں را امبے

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے۔ جہاں کسی منظر یا حالت کا بیان کرتا ہے، سیکڑوں نئی تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے، اور یہ اس کا خاص انداز ہے، اس ہمہ تن کے ساتھ کوئی تشبیہ جدت سے خالی نہیں ہوتی، اس زمانہ تک خیالی اور فرضی تشبیہیں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اس لئے عموماً تمام شعرا محسوسات اور مادیات سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن وہی چند مفرد تشبیہیں تھیں جو بار بار ادا ہوکر مبتذل ہوگئی تھیں منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں اور اس کے ساتھ خاص جدت ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں،

آفتاب کا صبح کے وقت بتدریج طلوع ہونا،

بکردار چراغ نیم مردہ — کہ ہر ساعت فزوں گردش روغن

یعنی آفتاب کی روشنی اس طرح آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، کہ جس طرح ایک چراغ جو بجھ چلا تھا، اس میں کوئی شخص بتدریج تیل ڈالتا جاتا ہے۔

زمین کا بھونچال سے لرزنا،

تو گفتی ہر زمانے زندہ پیلے — ز زد سرخ یک دست آہ سخن

یعنی زمین بھونچال سے اس طرح جنبش میں ہے، جس طرح ہاتھی مچھروں کے اذیت دینے سے جھرجھریاں لیتا ہے،

ہلال — ہمناں چوں دو سر از ہم باز کردہ — ز زر سرخ یک دست آورنجن

یعنی پہلی رات کا چاند اسی طرح نظر آتا ہے کہ گویا کسی نے طلائی کڑے کے دونوں سرے کھول دیئے ہیں۔

بید کے پتے — داں برگ ہاے بید تو گوئی کسی قصید — پیکانہا ہے ہین ز برجد کند ہمے

بید کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں، کہ گویا کسی نے دانستہ زمرد کے پیکان چوڑے بنائے ہیں۔

ہدہد اور اس کی کلغی — بوبو یک پیکے نامہ زدہ اندر سر خویش — نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ہدہد گویا نامہ بر ہے جس نے خط کو اپنی پگڑی میں کھونس لیا ہے۔ کبھی اس کو کھولتا ہے، کبھی تہ کرکے لپیٹ لیتا ہے۔

ہدہد اکثر اپنی کلغی کو پھیلا دیتا ہے۔ اور پھر سمیٹ لیتا ہے۔

مناظر قدرت کے اشعار جو اوپر گذرے ہیں، ان میں بھی اکثر تشبیہات ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیے،

# پانچویں اور چھٹی صدی

پانچویں اور چھٹی صدی کے آغاز میں اگرچہ شاعری کی ترقی کی رفتار گھٹ گئی جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس صدی کے وسط میں غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو چلا تھا، اور نئی طاقتیں ابھی شباب تک نہیں پہنچی تھیں، لیکن صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ غزنوی سلطنت کا زور سلجوقیہ کیطرف منتقل ہو گیا، دفعتہً بحر سخن میں طوفان آ گیا، سلجوقیہ کا پہلا فرماں روا رکن الدین طغرل بگ تھا جو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام نیشاپور مسند نشین ہوا، اس سلسلہ نے اگرچہ صرف ۱۶۳ برس کی عمر پائی، لیکن اتنی ہی تھوڑی مدت میں جو باتیں اس نے حاصل کیں، تاریخ اسلام کو اس سے گوناگوں اور وسیع تعلقات ہیں، اول تو اس سلطنت نے جو وسعت پیدا کی، ابتدائے اسلام سے آج تک کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی، اسی کے ساتھ عدل و انصاف اور امن و امان کا یہ حال تھا۔ کہ خراسان سے شام تک ایک رہرو تن تنہا سونا اچھالتا جاتا تھا، اور کوئی خبر نہیں ہوتا تھا، ایک عجیب بات یہ ہے۔ کہ ایران، عراق، روم میں جو بڑی بڑی پر زور سلطنتیں قائم ہوئیں، سب کی سب اسی سلسلہ کی شاخیں تھیں، ترکوں سے پہلے جو سلاطین شاہان روم کہلاتے تھے، اسی خاندان کی ایک شاخ تھے، سلاطین خوارزم شاہیہ جن کی شوکت و شان محتاج بیان نہیں ان کا مورث اول یعنی نوشتگین اسی خاندان کا غلام زر خرید تھا، اتابکوں کے متعدد خاندان جن میں سے نور الدین زنگی سلطان صلاح الدین کا آقا، قزل ارسلان ظہیر کا ممدوح اور اتابک ابو بکر ابن سعد زنگی شیخ سعدی کا مربی اور سرپرست تھا، سب اسی خاندان کے غلام یا خداوند زادے تھے۔

سلجوقیہ کے اوج شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے، اور یہی دور فارسی شاعری کا معراج شباب ہے، سلجوقی شعراء کی فہرست نہایت وسیع ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں،

امیر معزی، ارزقی، لامعی، فخر الدین اسعد، شہابی خراسانی، عبد الواسع جبلی، انوری، حسن غزنوی، رضی الدین نیشاپوری، ادیب صابر، علی باخرزی، فتوحی مروزی، فرقدی، کافی ہمدانی، نظامی گنجوی، شمس الدین خراسانی، سوزنی، ابو المعالی، (مجمع الفصحاء کے دیباچہ میں اور بہت سے نام لکھے ہیں)

اس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں،

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی، لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی، شاعری کی زبان اب تک ٹکسالی نہ تھی، شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی، اور غزنویہ کے عہد میں اوجِ ترقی تک پہنچی، ان خاندانوں کے پایہ تخت بخارا اور غزنین تھے، جہاں کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی، شعراء جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہی مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران اصلی مرکز یعنی شیراز، اصفہان و نیشاپور سے دور تھے، فرخی، سیستانی تھا، عنصری بلخ کا رہنے والا تھا، منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا، عسجدی اور دقیقی مرد کے رہنے والے تھے،

سلجوقیہ نے نیشاپور کو پایۂ تخت قرار دیا، اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے، اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف شیریں اور محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے،

اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی، فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے، چنانچہ دولت شاہ سلجوقی نے طبقۂ اول کے شعراء کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا، سلطنت کی زبان بن کر کس قدر ترقی کر گئی ہو گی،

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا، امیر معزی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا اور بڑے بڑے شعرا پایۂ تخت کے شاعر قرار پائے دولت شاہ لکھتا ہے،

"امّا از شعرائے بزرگ کہ در دور سلطان سنجر بودہ اند، و مدح سلطان گفتہ اند و صلہ و تربیت یافتہ، ادیب صابر است و رشید وطواط و عبدالواسع جبلی و فرید کاتب و انوری خاوڑانی و ملک عمادی و سوزنی و سید حسن غزنوی و مہتی دبیرہ کہ محبوب سلطان و ظریفہ روزگار بود"[۲]

(۱) ملک شاہ ۴۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ۴۸۵ھ میں وفات پائی اس کے بعد سنجر نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نہایت بیس برس تک اور پھر مستقل حکومت کی اور ۵۵۲ھ میں انتقال کیا،

(۲) دولت شاہ ذکر عمق بخاری،

سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں، اُن سے انداز ہو سکتا ہے۔ کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی،

ایک دفعہ ارکانِ دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اُچھل پڑا، سب کو اُنگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے، معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پاکر اس نے برجستہ کہا،

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی — یا ہمچو کمان شہریاری گوئی

نعلے زدہ از زر عیاری، گوئی — در گوش سپہر گوشواری گوئی

یعنی اے چاند تو ابروے معشوق ہے، یا بادشاہ کی کمان، یا سونے کا نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ"

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا،

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید — از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکے ترانہ از من بشنید — چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب میں شامل کیا جائے، چونکہ سنجر کا لقب معز الدین تھا، اس لئے معزی لقب پڑا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے[1]،

ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا، اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی، اور سنجر گھوڑے سے گر گیا، معزی نے برجستہ یہ رباعی پڑھی،

مضمون آفرینی

شاہا ادبے کن، فلک بدخو را — کو چشم رسانید رخ نیکو را

گر گوے خطا کرد بزن چوگانش — ور اسپ خطا کرد بمن بخش او را

یعنی اے بادشاہ! زمین کو ذرا تنبیہ کر دیجئے، اس نے آپکو نظر لگادی، اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اُس کو ماریئے، اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالہ فرمایئے اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے، سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا، معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی،

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم — گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم

نے گاو زمینم کہ جہاں بر گیرم — نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی، اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سن لیجئے، میں کچھ

---

[1] مجمع النفائس اور

گاؤ زمیں تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھا لوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں، مطلب یہ کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاؤ زمیں اور آفتاب کا کام ہے،

مہستی ایک مشہور شاعرہ تھی، جس کی حاضر جوابیاں اور ظریفانہ فقرے مشہور عالم ہیں، سنجر کی شاعرانہ صحبتوں میں وہ بھی شریک ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ مجلسِ عیش قائم تھی، مہستی بھی موجود تھی، کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا برف پڑ رہی ہے، واپس آئی، سنجر نے پوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے مہستی نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی،

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد — وز جملہ خسرواں ترا تحسین کرد
تا در حرکت، سمند زریں نعلت — بر گِل ننہند پاے زمیں سیمیں کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں زمین پر چاندی بچھادی، سنجر نہایت محظوظ ہوا، اور اسی دن سے مہستی سنجر......... کے مقربین میں داخل ہو گئی،

غزنوی خاندان نے بھی اس عہد میں سنبھالا لیا، بہرام شاہ جو سلطان محمود کی چوتھی پشت میں تھا، اور ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہُوا تھا، نہایت شان و شوکت کا بادشاہ اور نہایت علم دوست اور مربّی فن تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کا تذکرہ اِن لفظوں سے شروع کیا گیا ہے،

"او بادشاہے بود ذی شوکت و صاحب حشمت، با علما و فضلا بسیار نشستے و صحبت ایشاں دوست داشتے، و ہر کسے را بقدرِ علمش رعایت کردے، لہذا فضلاے روزگار باسم شریفش کُتب ساختہ اند و تصنیفات پرداختہ اند"

کلیلہ و دمنہ جس کا ترجمہ پہلوی زبان سے عبد اللہ بن المقفع نے عربی میں کیا تھا بہرام شاہ کے حکم سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی، اور یہ پہلا دن تھا کہ ایران اور ہندوستان میں اس کا رواج ہوا، بہرام شاہ کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حکیم سنائی نے جو تعلقات دُنیوی سے آزاد ہو چکے تھے، اپنی کتاب حدیقہ اس کے نام پر لکھی، بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی،

ان سلاطین کے علاوہ اور بڑے بڑے دربار تھے، جہاں شاعری کی تربیت کی جاتی تھی، ان میں سب سے زیادہ علم دوست طغان شاہ سلجوقی تھا، چہار مقالہ میں لکھا ہے؛

"آلِ سلجوق ہمہ شعر دوست بودند، اما ہیچکس شعر دوست تر از طغان شاہ الپ ارسلان نبود،

محاورت و معاشرت او ہمہ با شعرا بود و ندیمان او ہمہ شعرا بودند، چوں امیر عبداللہ قریشی و ابوبکر ازرقی، و ابو منصور یوسف و شجاعی نوی و احمد بدیہی و حقیقی و نسیمی اینہا مرتب خدمت بودند و آیند و روند بسیار بودند"

اسی طرح شروان شاہ کے دربار کا ملک الشعرا خاقانی اور خوارزم شاہ کا رشید الدین وطواط تھا،

صوفیانہ شاعری

بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ تصوف اور اخلاق شاعری کا سنگِ بنیاد اسی عہد میں رکھا گیا، اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے، یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی، چنانچہ اس کی تفصیل حکیم سنائی، اوحدی اور خواجہ فرید الدین عطار کے حالات میں آئیگی،

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ شاعری بھی اسی دور کی یادگار ہے، فلسفہ کے خیالات سب سے پہلے حکیم ناصر خسرو نے اشعار میں ادا کئے، لیکن وہ محض فلسفہ ہی فلسفہ تھا، شاعری نہ تھی، برخلاف اس کے عہد میں عمر خیام نے فلسفیانہ مسائل اور خیالات کو اس انداز سے ادا کیا کہ ظاہر ہیں آدمی کو اس میں صرف شاعری نظر آتی ہے، حالانکہ وہ فلسفیانہ نازک مسائل ہیں جو دلکش اور لفریب پیرایہ میں ادا کر دیئے گئے ہیں،

اس عہد تک شاعری میں عشق و عاشقی کی رُوح نہ تھی، مثنوی رزم پر محدود تھی، قصائد کا مقصود مداحی تھا، تشبیب میں معشوق کا جو ذکر کرتے تھے، وہ صرف عرب کے قصائد کا اتباع تھا، ساقی اور حسین بچوں کا ذکر کرتے تھے تو اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی، جس طرح امرا کے ہاں تازگی نظر کے لئے پیش خدمت اور غلام، حسین اور خوشرو رکھے جاتے تھے، اس عہد میں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جدا گانہ صنف قائم کردی، عرب و عجم میں عاشقی میں جو نامور تھے یعنی مجنوں و فرہاد، ان کے حالات میں مثنویاں لکھیں، صرف عاشقانہ جذبات اور خیالات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بزم اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لئے مستقل لٹریچر پیدا کر دیا، جس پر آگے چل کر متاخرین نے بڑی بڑی عمارتیں قائم کیں، غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنمکدہ کے آذر نظامی ہی ہیں،

قصائد کی صنف کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، مضامین میں تو کسی قسم کی جدت پیدا نہیں ہوئی، مداحی، خوشامد، مبالغہ پہلے سے بھی بڑھ گیا، البتہ لفظی صناعیاں کمال کے درجہ کو پہنچ گئیں، عبدالواسع جبلی اور رشید الدین وطواط نے الفاظ پر اس قدر قابو پیدا کر لیا، کہ جس نوع اور جس ترکیب

جس انداز کے الفاظ چاہتے ہیں، ان کا انبار لگا دیتے ہیں، قصیدے کے قصیدے ہیں، جن میں تمام الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں جس کو اصطلاح میں صنعت طباق کہتے ہیں، بعض قصیدوں میں التزام کرلیا ہے کہ الف کا حرف جو سب سے عام حرف ہے نہ آنے پائے، باوجود اس کے یہ قصاید ایسے برجستہ اور رواں ہیں کہ جب تک بتا نہ دیا جائے کہ اس میں اس صنعت کا التزام کیا گیا ہے، ادھر طرف خیال بھی منتقل نہیں ہوسکتا، اکثر قصیدوں میں یہ التزام ہے کہ ہر مصرع میں پانچ پانچ چھ چھ الفاظ ہیں، اور پہلے مصرع میں جس قدر الفاظ آئے ہیں دوسرے مصرع کے تمام الفاظ بھی انہی الفاظ کے ہموزن، بلکہ ہم قافیہ ہیں، باوجود اس کے کسی قسم کا تکلف نہیں معلوم ہوتا،

عبدالواسع جبلی نے مسجع کو قافیوں تک پہنچایا، جس سے وہ صورت پیدا ہوگئی، جس کو عوام بحر طویل کہتے ہیں مثلاً

یا صاحبی الیش الجز، زاں سرو قد سیمبر، کز عشق او گشتم سمر، تشنہ لب و خستہ جگر، بر کندہ جان افگندہ سر، با کام خشک و چشم تر، کردہ ز غم زیر و زبر، دنیا و دین و جان و تن، یہ ایک مصرع ہے،

یہ قاعدہ ہے کہ جب بارش اچھی ہوتی ہے، تو جو اور گیہوں کے ساتھ مختلف قسم کی زہریلی گھانس اور خاردار درخت اور بوٹے بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ شاعری کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے، جس کے چمن آرا انوری اور سوزنی ہیں،

ہم اس دور کے چند مشہور شعراء کا تذکرہ لکھتے ہیں،

# حکیم سنائیؒ

مجدود نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا، ابتدا میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے، چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے۔ جو دیوان میں موجود ہیں، لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی، توبہ کا سبب ایک دلچسپ قصّہ ہے، بہرام شاہ ہندوستان کی مہم پہ جارہا تھا، حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کریں قصیدہ تیار کرکے، دربار کے قصد سے چلے، راہ میں ایک حمام تھا، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا، اس کا معمول تھا۔ کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا، اسی لئے اس کو لاے خوار کہتے تھے، حکیم سنائی حمام کے برابر سے نکلے، تو غنغنانے کی آواز سنی، ٹھہر گئے، دیکھا تو لای خوار ساقی سے کہہ رہا ہے کہ ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ

دیتا، ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو، ابراہیم شاہ نہایت عادل بادشاہ ہے، پاگل نے کہا، ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا، دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے، اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی یہ کہہ کر پیالہ اُٹھایا اور پی گیا، پھر ساقی سے کہا کہ سنائی کے صدقہ میں ایک پیالہ اور اور لانا، ساقی نے کہا، سنائی نہایت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے، اُس کی برائی کیوں کرتے ہو؟ پاگل نے کہا۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ وہ چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہے، ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے، اور اُس کو سُناتا ہے، قیامت میں اگر سوال ہوا کہ دربار میں کیا لایا ہے، تو کیا جواب دیگا؟[1]

حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا۔ کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے، اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتے تھے، یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو اُن کے عقدِ نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا،

من نہ مرد زن و زر و جاہم　　بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم　　بہ سر تو کہ تاج نستانم

ید بیضا میں لکھا ہے کہ سر و پا برہنہ حج کو گئے، وہاں سے واپس آکر غزنین میں گوشہ نشینی اختیار کی، ننگے پاؤں غزنین کے گلی کوچہ میں پھرا کرتے تھے، ان کے عزیزوں کو رحم آتا، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے، یہ ان کو سمجھاتے کہ میری حالت پر رونا نہیں، بلکہ خوشی کرنی چاہیئے، ایک دن لوگوں نے جوتی لاکر پیش کی، اُن کی خاطر سے پہن لی، لیکن اتنا تعلق بھی ان کی حالت میں خلل انداز ہوا، چنانچہ دوسرے دن جوتی اُتار کر پھینک دی اور کہا کہ جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں، امیر خسرو نے اسی واقعہ کی طرف ایک قصیدہ میں اشارہ کیا ہے[2]

نیست مدبر آں ترک از خود بدارد کفش از پا　　ہر شگاف از پا نمایش دین و دولت آورا ست

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، ان کو خبر ہوئی، اسی وقت رئیس کو خط لکھا کہ۔

ن الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا، گوشۂ دل این گوشہ گرفتہ را بہ تفقد

---

؎١ نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجائے سلطان محمود کا نام لکھا ہے، اسی بنا پر تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے ؎٢ یہ تمام تفصیل دولت شاہ میں ہے۔

ستائش خود خراب شود کند جسم حقیر این بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است[۱]"

اس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشائخ میں سے تھے، حکیم سنائی نے ان سے بیعت کی، شیخ ابو یوسف، ابو علی فارمدی کے مرید تھے۔ جو امام غزالی کے پیر ہیں، اس رشتہ سے حکیم سنائی، امام غزالی کے برادر زادہ ہیں،

حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں۔ اس لئے علماء نے سخت مخالفت کی، یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی، بہرام شاہ نے دار الخلافتہ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں، حکیم سنائی نے اپنی برارت کے متعلق ایک خط بھی بہرام شاہ کے نام لکھا، عبدالقادر بدایونی نے اس خط کو پورا نقل کیا ہے، اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس بات پر ناراض تھے کہ حکیم سنائی نے حدیقہ میں بنی امیہ کی نہایت برائی لکھی تھی، اور اہل بیت کی مدح میں مبالغہ کیا تھا، حکیم سنائی نے ان دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور لکھا کہ آل مروان کی برائی میں شک نہیں، لیکن حدیثیں جو اُن کی شان میں مذکور ہیں، سب وضعی اور جعلی ہیں،

حکیم سنائی کی وفات میں سخت اختلاف ہے، تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہرام شاہ کے زمانہ میں وفات پائی، اسی تاریخ میں بعض فضلا کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا، اور اسی سنہ میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی دولت شاہ نے ۵۷۶ھ میں لکھا ہے، ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہے، تحقیقات

نفحات میں لکھا ہے کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا،

باز گشتم زانچہ گفتم زاں کہ نیست　　　در سخن معنے و در معنی سخن،

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں تیس ہزار شعر ہیں، سات مثنویاں ہیں، حدیقہ، سیر العباد، کارنامہ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہروز بہرام حدیقہ چھپ گئی ہے، اور ہر جگہ ملتی ہے، باقی مثنویاں ناپید ہیں۔ البتہ سیر العباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحاء میں نقل کئے ہیں، حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہے،

کلیات میں قصائد، قطعے، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہے، اور افسوس یہ ہے۔ کہ ان پھولوں میں ہجو کے کانٹے بھی ہیں،

---

[۱] نفحات

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ تشبیب اور قصائد میں انہوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی، لیکن پختگی، برجستگی، اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے، اور قدما بھی فرخی کے سوا، اس خصوصیت میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں، فرخی کے قصیدہ کا جو جواب لکھا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دوش سرمست نگارین من آں طرفہ پسر ‏ ‏ یا یکے پیرہنے با کلہے طرفہ بسر
از سر کوچہ فرود آمد متواری وار ‏ ‏ کردہ از غایت دلتنگی صد گونہ طرر
نرم نرمک ہمی آں نرگس خواب کُشا ‏ ‏ ژالہ ژالہ عرق از عارض وکردہ اثر
بوسہ بر دولب من داد ہمی از پے عُذر ‏ ‏ ایں شوریدہ نگارانیت شکر و بسہ بسر
شادماں گشتم ازیں کار و گرفتمش کنار ‏ ‏ ہمچو تنگ شکر و خرمن گل تنگ ببر
او شدہ خواب من از بوسہ و من برد ورخش ‏ ‏ باد و چشمہ و دو رخش تا بہ سحر خفت سہر
خود کہ داند؟ کہ دراں نیم شب از مستی او ‏ ‏ تا چہ برداشتم از بوسہ و ہر چیزے بر

یہی مضمون ہے جس کو قاآنی نے زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مست در بستر من خفتہ ندانم دانند ‏ ‏ حالت مست کہ در بستر مشایر افتند
ایں اشک من و رنگ رخ من بر اے شوخ ‏ ‏ ایں را بہ کلہ بر زن و آں را بہ کمر بہ

یعنی اے معشوق اپنے بند، اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے، میرا آنسو اور میرے چہرے کا رنگ لے کر کلاہ اور کمر پہ لگالے کہ زر و گوہر کا کام دینگے، آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے۔

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا، اس سے پہلے حضرت ابو سعید ابو الخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوش عشق کو پُر زور طریقہ سے ادا کیا ہے، تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں، بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں، خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعوےٰ ہے، چنانچہ حدیقہ میں کہتے ہیں،

کس نہ گفت ایں چنیں سخن بجہاں ‏ ‏ ور کسی گفت گو بیار بخواں
زیں نمط ہر چہ در جہاں سخن است ‏ ‏ گر یکے در ہزار آنِ من است

چوں ز قرآں گذشتی وز اخبار — نیست کس را ازیں نمط گفتار

اس دعوے کو اکابر صوفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں،

ترک جوشے کردہ ام من نیم خام — از حکیم غزنوی بشنو تمام

عطار روح بود و سنائی دو چشم او — ما از پس سنائی و عطار آمدیم

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہے، اور نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں صوفیانہ شاعری پر ریویو ہوگا حدیقہ کے انتخابات درج کئے جائیں گے،

۳- قدما کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی، لیکن طرز ادا شاعرانہ نہ تھا، جس بات کو کہنا چاہتے تھے، صاف، بے تکلف، سیدھے سادھے طور پر کہہ دیتے تھے، معمولی بات کو انوکھے پیرایہ میں ادا کرنا، یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے، لیکن اس کے موجد حکیم سنائی ہیں، اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے،

۴- اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی، اور آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دیئے تھے،

اخلاقی شاعری کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ جو بات کہی جائے اس کے لئے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھا جائے کہ سننے والے کو معلوم ہو۔ کہ اس سے پہلے کسی نے اس کی اصلی حقیقت نہیں ظاہر کی تھی، اور یہ کہ وہ جس کام کو معمولی بات سمجھتا تھا، وہ نہایت نفرت انگیز اور بدترین افعال ہے، اس کے لئے شاعر کو ضرور ہے کہ وہ سامنے کی باتوں سے ایسے نتائج پیدا کرے جو بظاہر بالکل اچھوتے معلوم ہوں، اور جس کی طرف خیال نہ گیا ہو۔

مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کر دیتا ہے، لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، اب دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں، انہوں نے دیکھا کہ طبیب اکثر پارسی، عیسائی، یہودی، ہوتے ہیں، یہ بھی دیکھا کہ جن چیزوں کو طبیب منع کر دیتا ہے، اکثر حلال ہوتی ہیں، مثلاً حلوا مٹھائی وغیرہ، اور شریعت جن چیزوں کو منع کرتی ہے وہ مضر اور ناجائز ہوتی ہیں، ان باتوں سے انہوں نے اس طرح کام لیا،

ترا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ — ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا

نہ بہر دین تو نگذاری حرام از حرمت یزداں ... ولیک از بہتر تن مانی، حلال از گفتۂ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا کہ شراب نہ پیو، اور عیسائی (طبیب) کہتا ہے کہ حلوا نہ کھاؤ، حلوا حلال چیز تھی، اس کو تو تم نے ایک عیسائی کے کہنے سے چھوڑ دیا، اور شراب جس کو تم خود بھی ناجائز سمجھتے ہو، خدا کے کہنے سے بھی نہیں چھوڑتے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم خدا کے حکم کو ایک عیسائی کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے،

اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ انسان مر کر تمام جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے، اس سے حکیم سنائی نے نصیحت کا یہ پیرایہ پیدا کیا ہے:

باہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں ... بیشتر گمرہ و کمتر برہ اند،

آں چناں زی کہ چو میری برہی ... نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یعنی لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ جب مرو تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ، نہ یہ کہ جب تم مرو تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں، یعنی تمہارے افعال سے ہر شخص تنگ آ رہا تھا، اس لئے جب تم مرو گے تو لوگوں کو نجات ہو گی،

شراب کی برائی کا یہ پہلو ہر شخص جانتا ہے کہ نشہ میں انسان بیہودہ بکتا ہے، گالیاں دیتا ہے، لڑتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان بیہودہ بکتا ہے، گالیاں دیتا ہے، لڑتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان نشہ کی حالت میں فیاض اور کرم گستر بن جاتا ہے اور یہ تعریف کا پہلو ہے، اب دیکھو شاعر اس تعریفی پہلو سے کیونکر شراب کی برائی کا یقین دلاتا ہے،

نکند عاقل مستی، نخورد دانا مے ... نہ نہد دم ہشیار سوی مستی پے

گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او ... ور نہ کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

یعنی شراب ایسی چیز ہے کہ انسان اگر سخاوت بھی کرتا ہے تو لوگ اس کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ شراب کا فیض ہے،

از پے رد و قبول عامہ خود را خر مکن ... زاں کہ نبود کار عامہ، خرخری یا فرفری

گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں ... نوح را باور ندارد از پے پیغمبری

اس قدر سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی قوم نے گوسالہ کی پرستش کی تھی، اور آج بھی ہندوؤں کے نزدیک گائے نہایت مقدس چیز ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت نوح

کو ان کی اُمت نے پیغمبر تسلیم نہیں کیا، ان دونوں باتوں سے شاعر نے نتیجہ نکالا کہ عوام کا رد و قبول کس قدر ناقابل اعتبار ہے، ماننے پر آئے تو گائے کے بچھڑے کو خدا بنا دیا، اور انکار کی طرف جھکے تو حضرت نوح ؑ کو پیغمبر بھی تسلیم نہیں کرتے،

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں بھی ہیں، اور برائیاں بھی، اس لئے ارباب حال دونوں طرف گئے ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں،

کسے کش خرد رہنموں است ہرگز ۔۔۔ بگیتی رہ و رسم الفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی ۔۔۔ دل مرد دانا ازیں ہر دو لرزد
اگر خود نفاقی است جاں را بکاہد ۔۔۔ وگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہانِ روح ہے، اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے، تب بھی اس لئے بری ہے کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جاں گزا ہوگا،

بہ حرص[۱] ار شربتے خوردم مگیر از من کہ بد کردم ۔۔۔ بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

چوں[۱] تو شدی پیر بلندی مجو ۔۔۔ کاں کہ ز تو زاد، بلند آں شود
روز نہ بینی کہ بپایاں رسد ۔۔۔ سایۂ ہر چیز دو چنداں شود
زشتی[۱] باشد روے نازیبا و ناز ۔۔۔ سخت باشد چشم نابینا و درد

باو[۲] و قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست ۔۔۔ یا رضائے دوست باید، یا رضائے خویشتن
سوے[۳] آں حضرت نپوید ہیچ دل با آرزو ۔۔۔ با چنیں گل رخ نخسپد ہیچکس با پیرہن

ایں جہاں بر مثال مردار یست ۔۔۔ کرکساں گرد او ہزار ہزار
ایں مر آں را ہمی کشد مخلب ۔۔۔ آں مر آں را ہمے زند منقار
آخر الامر بگذرند ہمہ ۔۔۔ وز ہمہ باز ماند ایں مردار

۵۔ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے، ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے، فارسی شعرا میں مولانا روم پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے، خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں،

---

[۱] گناہ کی معذرت [۲] بوڑھے جواں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔
[۱] بدلیاقت آدمی کو غرور اور زیادہ بدنما ہے ۔ [۲] یکسوئی ۔
[۳] مقام وصال میں ترک آرزو ۔
[۴] دنیا اور طالبانِ دنیا،

لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں، اشعار ذیل کو پڑھو، اور ان کے الفاظ ترکیب، انداز بیان، مضمون، ایک ایک چیز کو دیکھو کس طرح جوش سے لبریز ہیں۔

بابرو، ہچوں زناں رنگے و بوی پیش گیر ‏ ‏ یا چو مرداں اندر آئے وگوی در میدان فگن

چوں دو عالم زیر پایت نطع شد پائے بکوب ‏ ‏ چوں دو کون اندر دو دستت جمع شد دستی بزن

سر برآر از گلشن توحید تا در کوی دیں ‏ ‏ کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

دی ز دل تنگی زمانے طوف کردم در چمن ‏ ‏ یک جہان جان دیدم آنجا جستہ از زندان تن

بے طرب خوشدل طیور وبے طلب جنباں صبا ‏ ‏ بے دہاں خنداں درخت و بیزباں گویا چمن

---

طلب اے عاشقان خوش رفتار ‏ ‏ طرب اے شاہدان شیریں کار

تا کے از خانہ ہاں رہ صحرا ‏ ‏ تا کے از کعبہ ہیں در خمار

در جہاں شاہدے وما فارغ! ‏ ‏ در قدح جرعۂ و ما ہشیار

بسکہ شنیدی صفت روم وچیں ‏ ‏ خیز و بیا ملک سنائی بہ بیں

تا ہمہ دل بینی بے حرص و بخل ‏ ‏ تا ہمہ جاں بینی بے کبر و کیں

پای نہ و چرخ بزیر قدم ‏ ‏ دست نہ، و ملک بزیر نگیں

رستہ ز ترکیب زمان و مکاں ‏ ‏ جستہ ز ترتیب شہور و سنیں

روح ایں دادہ بد ہنش ہمانکہ ‏ ‏ دادہ بہ مریم زرہ آستیں

۶- شاعری کے اجزاء میں ایک بڑا ضروری جزو تمثیل اور تشبیہ ہے، شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعوی کرتا ہے تو دلیل میں اس کو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے، کبھی کسی چیز کی اچھائی یا برائی ثابت کرنا، یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، اسی بنا پر اکثر بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدی، صائب، کلیم وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے، شاعری کی اس صنف کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں، ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا کہ ان کی تمثیلیں کس قدر نادر اور مؤثر ہوتی ہیں،

ہر خسے از رنگ در فتارے بدیں رہ کے رسد ‏ ‏ درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن

ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل ‏ ‏ شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش ‏ ‏ صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب ‏ ‏ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

حصول مقصد کیلئے دیر اور انتظار شرط ہے

اور جو مقصد جسقدر اہم ہوگا اسی قدر زیادہ دیر ہوگی؛

ساعتِ بسیار می باید کشیدن انتظار
تا کہ در جوفِ صدف باراں شود دُرِّ عدن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطفِ طبع
عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن
صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز
تا قرینِ حق شود صاحبقرانے در قرن

---

تو علم[1] آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب
چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو[2] تن جاں را مزیّن کن بہ علم و دیں کہ زشت آید
درون سو شاہ عریاں و بروں سو کوشک دیبا

اب حکیم سنائی کے بعض قطعات و قصائد کے اشعار یکجا لکھتے ہیں، جس سے ان کی عام شاعری کا اندازہ ہو سکے گا،

بہر چہ از راہ باز افتی چہ کفر آں حرف چہ ایماں
بہر چہ از دوست وا مانی چہ زشت آں نقش چہ زیبا
چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا
مرا بارے بحمد اللہ ز راہِ حکمت و ہمت
بسوئے خطِ وحدت برد عقل از خطۂ اشیا
نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنّت
ہمے گویم بہر ساعت چہ در ضرّا چہ در سرّا
کہ یارب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت
چناں کز وی بہ رشک آید روانِ بو علی سینا
مگرواں عمر من چوں گل کہ در طفلی شوم کشتہ
مگرداں حرص من چوں مل کہ در پیری شوم برنا
بہر چہ از اولیا گفتند اَذِقْنِیْ وَ اَرِفْقْنِیْ
بہر چہ از انبیا گفتند آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا

---

پردہ دار عشق داں رسمِ ملامت بر فقیر
پاسباں ور شناس ایں آبِ تلخ اندر بحار
اے بسا غبنا کہ اندر حشر خواہد بد ازاں کہ
ہست ناقد بس بصیر و نقدہا بس کم عیار
عقل جزوی کے تواند گشت بر گیہاں محیط
عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار
کے شود ملک دو عالم تا تو باشی ملکِ آں
کے بود اہلِ نثار آں کس کہ بر چیند نثار
باش تا کل یابی آنہا را کہ امروزند جزو
باش تا گل یابی آنہا را کہ امروزند خار

---

گوئی کہ بعد ما چہ کنند و کجا روند
فرزندگان و دخترگاں یتیم ما،
خود یاد ناوری کہ چو کردند و چوں شدند
آں مادراں و آں پدراں قدیم ما،

---

[1] علم زیادہ پُر خطر گناہوں کا سبب ہو سکتا ہے۔

[2] صفائی ظاہری کے ساتھ صفائی باطن بھی مشروط ہے۔

آدمی را دو بلا کرد رہے ، داند از ہر دو بلا، روز بہی،
یا کند پر شکم خویش زناں یا کند پشتِ خود از آب تہی

---

# عمر و خیام بن ابراہیم نیشاپوری

عمرو نام، خیام لقب، نیشاپور وطن، غالباً آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا، جس کی وجہ سے خیّام کا لقب ملا، عمرو نے جب تحصیل شروع کی تو دو شخص اس کے ہم سبق تھے، ان میں رابطۂ محبت اس قدر بڑھا کہ سب نے عہد کیا کہ ہم میں سے جب کوئی شخص بڑے منصب پر پہنچے گا تو اپنے ساتھیوں کو بھی اپنا ہمسر بنائے گا، اس وقت دنیا کو کیا معلوم تھا کہ یہ مکتب کے لونڈے جو اس وقت ایک خیالی منصوبہ باندھتے ہیں، آگے چل کر دُنیا کی تاریخ بدل دیں گے، ان میں سے ایک کا نام حسن ابن علی اور دوسرے کا حسن تھا، حسن بن علی نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی الپ ارسلاں نے وفات پائی، اور ملک شاہ سلجوقی مسند آرا ہؤا تو وُہ کل سیاہ وسفید کا مالک تھا، یہی حسن ہے، جو آج نظام الملک (بانی نظامیہ بغداد) کے نام سے مشہور ہے، عمرو خیام کو جب معلوم ہؤا کہ میرا ہم سبق تاج و تخت کا مالک ہے تو اصفہان میں نظام الملک کے پاس آیا، نظام الملک نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا، نظام الملک کو اپنا عہد یاد تھا، خود پُوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، خیام جو کچھ چاہتا، اُس کو مل سکتا تھا، لیکن ملکِ قناعت کے شہنشاہ نے صرف معمولی وجہ معاش کی درخواست کی، نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں کم و بیش بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر مقرر کردی[1]، خیام نے اگرچہ صرف معمولی جاگیر پر قناعت کی، لیکن سلاطین و امراء اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے، شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، ملک شاہ سلجوقی جو دُنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا، اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا۔ دولت شاہ سلجوقی نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا، لیکن شہرزوری کی تاریخ الحکما سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے، شہرزوری[2] نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس زمانہ میں سنجر شاہزادہ تھا، اُس کو چیچک نکلی، خیام معالجہ کیلئے

---

[1] دولت شاہ، لیکن جاگیر کی آمدنی کی تعیین اور کتابوں سے ماخوذ ہے [2] تاریخ الحکماء شہرزوری۔

طلب ہُوا، وزیر نے خیام سے پُوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے، خیام نے کہا آثار اچھے نہیں، یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی، اس کو نہایت رنج ہُوا، اور یہ رنج ہمیشہ قائم رہا۔

۴۶۷ھ میں ملک شاہ نے ایک عظیم الشان رصد خانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، دُور دُور سے بڑے بڑے ہیئت دان اور منجم بلوائے، ان میں ابوالمظفر اسفزازی، میمون بن نجیب واسطی، اور ہمارا نامور خیام بھی تھا، ابن الاثیر نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس رصد خانہ پر بیشمار دولت صرف ہوئی، اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی، چنانچہ کشف الظنون زیچ ملک شاہی کے ذکر میں صاف تصریح ہے۔

خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا، اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا، یہ خیالات جب زیادہ پھیلے تو عوام میں سخت برہمی پیدا ہوئی یہاں تک کہ لوگوں نے اُس کو بیدین قرار دے کر قتل کر دینا چاہا، مجبوراً اس نے حج کا ارادہ کیا کہ حرم میں کوئی کسی کو ستا نہیں سکتا، حج سے فارغ ہو کر بغداد میں آیا، یہاں لوگوں نے نام سُنا تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے کہ علوم فلسفیہ سیکھیں، لیکن اُس نے انکار کیا، اور بغداد سے چل کر وطن میں آیا[1]۔

**وفات** اس کی وفات کا دلچسپ قصہ ہے، ایک دن بوعلی سینا کی کتاب الشفاء مطالعہ کر رہا تھا، جب وحدت و کثرت کی بحث آئی، تو اُٹھ کھڑا ہُوا، عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا، اُس کو ورق میں رکھ کر اُٹھا، نماز پڑھی، وصیّت کی، شام تک کچھ نہ کھایا، نمازِ عشاء پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا اے خدا جہاں تک میرے امکان میں تھا، میں نے تجھ کو پہچانا، اسلئے مجھ کو بخشدے یہی کہتے کہتے جان نکل گئی، مجمع الفصحا میں ہے کہ ۵۱۷ھ میں وفات پائی۔

دفن کا قصّہ اس سے بھی عجیب تر ہے، نظامی عروضی اس زمانہ کا مشہور شاعر ہے، جس کی کتاب چار مقالہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا بیان ہے کہ ۵۰۶ھ میں میں بلخ گیا، معلوم ہُوا کہ خیام آجکل یہیں امیر ابوسعید کے مکان پر مقیم ہے، میں خدمت میں حاضر ہُوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں بنے گی کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گے، مجھ کو تعجّب ہُوا، ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہو سکتا ۵۳۰ھ میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا، چونکہ مجھ پر

---

[1] تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی۔

شاگردی کا حق تھا، ایک آدمی کو ساتھ لیا کہ قبر کا پتہ بتائے، وہ قبرستان حیرہ میں لے گیا، دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر ہے، سرہانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں. شگوفہ جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہوگئے ہیں کہ قبر ڈھک گئی ہے، مجھ کو حکیم موصوف کا قول یاد آگیا، اور بے اختیار آنسو نکل پڑے،

**فضل وکمال** خیام کو آج زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے، لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب وتاریخ میں امامِ فن تھا، جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکما میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے" امام خراسان وعلامتہ الزمان، شہزوری تاریخ الحکما میں لکھتے ہیں، کان تلو ابی علی فی اجزاء علوم الحکمتہ وکان عالما باللغہ والفقہ والتواریخ، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اصفہان میں ایک کتاب نظر سے گذری، سات دفعہ اس کا مطالعہ کیا، نیشاپور میں واپس آیا تو ساری کتاب زبانی لکھوا دی، اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا[1]،

ایک دفعہ وزیر عبدالرزاق کے ہاں علمی صحبت تھی، ابوالحسن غزالی جو اس زمانہ میں فن قرأت کے امام تھے وہ بھی موجود تھے، اتفاق سے خیام بھی آنکلا، عبدالرزاق نے خیام کو آتا دیکھ کر کہا علی الخبیر سقطنا، یعنی واقف کار آگیا، مسئلۂ زیر بحث کو خیام کے آگے پیش کیا، اُس نے ساتوں قرأتیں، شاذ روایتیں، اور اُن کے دلائل اور وجوہ بیان کر کے ایک قرأت کو ترجیح دی، غزالی بے اختیار بول اُٹھے کہ حکما کا کیا ذکر خود قرا میں سے کسی کی یہ معلومات نہیں ہوسکتی۔

قاضی عبدالرشید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خیام سے میں مرو کے حمام میں ملا، اور سورۂ معوذتین کے معنی دریافت کئے، یہ بھی پوچھا کہ ان سورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے ہیں؟ خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا، مفسرین کے اقوال، اُن کے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے کہ اگر ساری تقریر قلمبند کر لی جاتی تو اچھی خاصی کتاب بن جاتی،

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علماء اس سے مخالفت رکھتے تھے، اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیشرو امام غزالی تھے، جنہوں نے تہافتہ الفلاسفہ لکھ کر فلسفہ کا ابطال کیا تھا، وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے، اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزا باہم متشابہ اور متحد الحقیقتہ ہیں، پھر بعض میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے، خیام مسائلِ فلسفیہ کے بیان کرنے میں

---

[1] شہزوری۔

نہایت تحمل کرتا تھا، اُس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بتفصیل لکھ چکا ہوں، پھر جواب دیا تو اس طرح کہ پہلے ابتدائی مراتب بیان کئے، چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ "حرکت کس مقولہ سے ہے"، پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی، امام غزالی یہ کہہ کر اُٹھ گئے جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا[1]

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے، لیکن یونانی حکما عموماً اس کے قائل تھے، وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے، خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا، اور اس لئے منجم کہلاتا تھا، ۵۰۸ھ میں بادشاہِ وقت نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں، خیام سے کہدو کہ اعمالِ نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو، خیام نے دو دن کے غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا، بادشاہ اسی دن سوار ہوا، کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف برف بچھ گئی، لوگوں نے خیام کی ہنسی اُڑائی، بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے پلٹ جائے، خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں، اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی، اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اُتری[2]۔

**تصنیفات** تصنیفات بہت کم ہیں، زیچ جو تیار کی تھی، اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے، باقی چند رسالے ذیل میں درج ہیں، جن کا ذکر شہرزوری نے کیا ہے،

طبعیات میں ایک مختصر رسالہ،

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ،

کون اور مسئلہ تکلیف پر ایک رسالہ، (یہ رسالہ آج کل مصر میں چھاپا گیا ہے)

عربی بہت سے شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج ہیں (از شہرزوری)

| | |
|---|---|
| یدن بولی الدنیا بل السبعة العلی | بل الافق الاعلی اذا جاش خاطری |
| اصوم علی الفحشاء جهرا و خفیة | عفافا وافطاری بتقدیس خاطری |
| وکم عصبة ضلت عن الحق فاهتدت | لطرف الهدی من فیضی المتقاطر |
| فان صراط المستقیم بصائر | نصبن علی وادی العمی کالقناطر |
| اذا قنعت نفسی بمیسور بلغة | یحصلها بالکد کفی وساعدی |

[1] شہرزوری [2] تاریخ الحکماء،

امنت تصاریف الحوادث کلها — فکن یا زمانی موعدی او مساعدی

دھبنی اتخذت الشعوبین منازلی — وفوق مناط الفرقدین مصاعدی

الیس قضی الرحمٰن فی حاکمه بانی — یعید الی نحس جمیع المساعد

متی باعدت دینا ل کان مصیبة — فوا عجا من ذا القریب المباعد

اذا کان محصول الحیاة منیة — فسیان حالا کل ساع و قاعد

رضیت دھرا صویلا فی التماس اخ — یرعی ادی اذا ذو خلة خانا

فکم الفت وکم اخیت غیر اخ — وکم تبدلت بالاخوان اخوانا

وقلت للنفس لما عز مطلبها — با اللہ ما تالفی ما عشت انسانا

**رباعیات** عجیب بات ہے، خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ میں کمال رکھتا تھا، لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اس کا اُفق شہرت بالکل تاریک ہے، جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا، وہ چند فارسی رباعیاں ہیں، اور یہی اس کی شہرت کے بال پرواز ہیں، ان رُباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر یورپ نے کیا،

ہماری کتاب کا اصل موضوع شاعری ہے، اس لئے سب سے پہلے ان رُباعیوں کی تنقید میں ہم کو شاعری کا پہلو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے، کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے تو نہ ہو، بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کے ساتھ زبان کی خُوبی اور صفائی ہے یا نہیں؟ یعنی خیام اگر حکیم نہ ہوتا تو کم از کم شاعر ہو سکتا تھا یا نہیں؟

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدّت اور دلآویزی ہے، شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دلکشا اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں، اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے، کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے، اور سچ یہ ہے کہ اس کی تمام ادائیں متعیّن اور مشخص نہیں ہو سکتیں، سُننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی، کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم،

خُوبی ہمیں کرشمۂ و ناز خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

خیام کی رُباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں، دُنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلۂ جبر، توبہ و استغفار، ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سَو سَو دفعہ کہتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے،

دُنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے، لیکن خیام ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈلاتا ہے کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے،

توبہ و استغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے، لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے، سُننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، بعض جگہ رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور وُہ بظاہر ایسا قوی ہوتا ہے کہ گویا اس کا جواب نہیں ہوسکتا، امثلۂ ذیل کو دیکھو،

**جدتِ اسلوب**

رباعی

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کُن | بر جان و دلِ اسیر من رحمت کُن

بر پائے خرابات رو من بخشائے | بر دست پیالہ گیر من رحمت کُن

مغفرت کی دُعا مانگتا ہے، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے (گو وُہ اسی کے ہاتھ پاؤں ہیں)، اس طریقہ سے دُعا کا اثر بڑھتا ہے، کیونکہ اپنے لئے دُعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہے، اس کے ساتھ نکتہ یہ ہے کہ اعضاء کی برأت آسانی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کیا قصور ہے، وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرسکتے،

ہاتھ اور پاؤں کے مقابلہ میں صنعتِ طباق ہے اور اس سے بھی ایک لُطف پیدا ہوگیا ہے،

در ملکِ تو از طاعت ما ہیچ فزود؟ | وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود

بگذار و مگیر ازاں کہ معلوم شد | گیرندۂ دیری و گذارندۂ زود؟

خدا سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہوگئی؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہوگیا، اے خدا مجھ کو چھوڑ دے اور گرفت نہ کر، مجھ کو معلوم ہوگیا ہے کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے اور جلد چھوڑ دیتا ہے،

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست | تاریک دلم نور صفائے تو کجاست

مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی | آں بیع بود لطف عطائے تو کجاست

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت

طاعت کے معاوضہ میں دے گا تو یہ تو خرید و فروخت ٹھہری (جو سوداگروں کا کام ہے نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا) وہ لطف وہ عطا جس کے قصے سُنا کرتے تھے، وہ کہاں ہے، یہی مضمون ہے، جس کو شیخ سعدی نے گلستان میں ادا کیا ہے، اور وہ گلستان کے خاص محاسن میں شمار کیا جاتا ہے، "بدریوزہ گری آمدہ ام نہ بہ تجارت"

آنم کہ پدید گشتم از قُدرت تو — صد سالہ شدم بنازو رنعمت تو
صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد — تا جرم من است بیش یا رحمتِ تو

دیکھو کس ادا سے مغفرت چاہتا ہے، کہتا ہے کہ میں سینکڑوں برس دانستہ گناہ کروں گا، گویہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے، یا تیری رحمت، یعنی دیکھوں ان دونوں میں کون غالب آتا ہے،

فریاد کہ عمر رفت بربیہودہ — ہم لقمۂ حرام ہم نفس آلودہ
فرمودۂ ناکردہ سیہ رویم کرد — فریاد زکردہائے نا فرمودہ

فرائض کو فرمودۂ ناکردہ، اور گناہوں کو کردہائے نافرمودہ سے تعبیر کیا ہے،
مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صُراحی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی، اس پر اُس نے رباعی لکھی،

ابریق می مرا شکستی ربّا — بر من درِ عیش را ببستی ربّا
برخاک بریختی مئے لعل مرا — خاکم بدہن کہ مستی ربّا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اس کو سزا دی اور اس کی گردن کج ہوگئی، اس پر اُس نے برجستہ کہا،

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو — واں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

یعنی میں نے بُرائی کی، اب تو اس کی سزا بھی ویسی ہی بُری دیتا ہے، تو مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق رہ گیا،
طلبِ مغفرت کا مضمون اکثر شعرا نے باندھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

گناہِ من ار نامدے در شمار — ترا نام کے بودے آمرزگار

اُردو کا ایک شاعر کہتا ہے،

عوض نہ لے مرے جُرم و گناہ بے حد کا | الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج | یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

لیکن خیام کا طرز ادا اور استدلال سب سے اچھوتا ہے، وُہ شاعرانہ استدلال سے سزا پانے کی حالت میں مجرم اور آقا کی مساوات ثابت کرتا ہے، اور پھر اس کو جُملۂ خبریہ کے ذریعے سے نہیں بلکہ استفہام کے طریقہ سے ادا کرتا ہے، جو نہایت موثر اور لاجواب کر دینے والا ہوتا ہے،

**شوخی و ظرافت** خیام باوجود حکیم ہونے کے نہایت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اس لئے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے، مثلاً

اے چرخ ز گردشِ تو خرسند نیم | آزاد کنم کہ لائقِ بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نا اہل است | من نیز چناں اہل و خرد مند نیم

ایشیا کا عام خیال ہے کہ آسمان ارباب خرد کو آرام اور چین نہیں دیتا، خیام آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تیری چالوں سے بہت تنگ آگیا ہوں، اگر تو احمقوں اور نا اہلوں ہی سے محبت رکھتا ہے تو میں بھی کچھ بہت اہل اور عاقل نہیں ہوں،

در مسجد اگرچہ بہر نیاز آمدہ ام | باللہ کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
یک روز ایں جا سجادہ دزدیدم | آں کہنہ شدہ است ازاں باز آمدہ ام

گویند کہ مے مخور کہ شعبان نہ رواست | نہ نیز رجب کہ آں مہ خاص خداست
شعبان و رجب مہ خدایند و رسولؐ | ما مے رمضان خوریم کاں خاصۂ خداست

ایران میں اکثر مہینوں کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً شعبان کو رسول کا مہینہ اور رجب کو خدا کا مہینہ کہتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ لوگ ان مہینوں میں شراب پینے سے منع کرتے ہیں کہ یہ خدا اور رسولؐ کے مہینے ہیں اور واقعی اُن کی یہ ہدایت بجا ہے، اس بنا پر میں رمضان میں شراب پیتا ہوں، کہ یہ خاص ہم لوگوں کا مہینہ ہے،

گویند کہ آں کساں کہ با پرہیز اند | زاں ساں کہ میرند بداں ساں خیزند
ما با مے و معشوق از انیم مقیم | تا بو کہ بحشر آں چناں انگیزند

مشہور ہے کہ انسان جس حالت میں مرتا ہے، اسی حالت میں قیامت میں اُٹھے گا، خیام کہتا ہے، اسی لئے تو میں رات دن شراب اور معشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی اسی حالت میں اُٹھوں،

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید | من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان بخورم چنداں مے | کاندر رمضان مست بخسپم تا عید

ایران میں جتنے شراب خوار ہیں رمضان میں شراب خواری چھوڑ دیتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ میں شعبان کے اخیر میں اتنی پی کر سوؤں گا، کہ عید کے بعد نشہ اُترے، قاآنی نے اسی مضمون کو نیچرل بنادیا ہے،

مے خوردنِ ایں ماہ روانیست ولیکن | مستانہ تواں خورد بہ شب یکدو سہ ساغر
یا خورد بداں گونہ بباید کہ زمستی | تا شام دگر بر نتواں خاست ز بستر

لیکن ایک اور شاعر نے سب سے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے، ایک غزل میں جس کی ردیف "نمی دانستم" ہے، کہتا ہے،

قربِ یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم | اتفاقاً رمضان بود نمی دانستم

ہر گہ کہ طلوع صبح ازرق باشد | باید کہ بکف جامِ مروق باشد
گویند بہ افواہ کہ مے تلخ بود | شاید کہ بہر حال کہ مے حق باشد

عربی کا فقرہ ہے، "الحق مُرٌّ" یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب کا مزہ تلخ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب حق ہے، مرزا غالب نے اسی سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے،

نگفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر | برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یعنی تم یہی ہدایت کرتے ہو نہ کہ انسان کو تلخی گوارا کرنی چاہیئے اور نصیحت سُننی چاہیئے، تو ہماری شراب تمہاری نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، ہم کو دوسری تلخی کی کیا ضرورت ہے،

دستِ چو منے کہ جام و ساغر گیرد | حیف است کہ آں دفتر و منبر گیرد
تو زاہد خشکی و منم فاسق تر | آتش نشنیدۂ کہ در تر گیرد

من در رمضان روزہ اگر میخوردم | تا ظن نبری کہ بے خبر میخوردم
از محنت روزہ روز من چوں شب شد | پنداشتہ بودم کہ سحر میخوردم

طبعم بہ نماز و روزہ چوں مائل شد | گفتم کہ مرادِ کلیم حاصل شد
افسوس کہ ایں وضو بباد ے بشکست | واں روزہ بہ نیم جرعہ باطل شد

اس میں ظرافت کے ساتھ اس بات کا بھی اشارہ ہے، کہ جو لوگ ظاہری نماز روزہ ادا کرتے

ہیں، ان کی عبادت کی ہستی بس اسی قدر ہے،

گویند کہ فردوس بریں خواہد بود — آں جاے ناب وحور خواہد بود
گر ما می و معشوق گزیدیم چہ باک — چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ بہشت میں بھی جسمانی آرام و عیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملیں گی، ظریفانہ پیرایہ میں ان کا رد کرتا ہے کہ اگر وہاں بھی یہی سب کچھ ہوگا تو اگر ہم نے دنیا ہی میں ان چیزوں کو پیشگی اختیار کر لیا تو کیا برا کیا،

زاہد گوید بہشت با حور خوش است — من میگویم شراب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست ازاں نسیہ بدار — آواز دہل شنیدن از دور خوش است
مارا گویند دوزخی باشد مست — قولی است خلاف دل درو نتواں بست
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود — فردا بینی بہشت را چوں کف دست

یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق اور مست بہشت میں نہ جانے پائیں گے تو دیکھ لینا بہشت چٹیل میدان کی طرح خالی پڑی ہوگی، یعنی عشق اور مستی لازمۂ انسانی ہے، اس سے کون شخص خالی ہو سکتا ہے۔

گویند بہشت و حور و کوثر باشد — جوے مے و شہد و شیر و شکر باشد
یک جام بدہ ز بادہ ام اے ساقی — نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد
از ہر چہ خورد مرا شراب اولیٰ تر — یا سبز خطاں بادۂ ناب اولیٰ تر
عالم ہمہ سر بسر بہ باطل ست خراب — در جاے خراب ہم خراب اولیٰ تر
ما ئیم خریدار می کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت — مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو
آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ — آں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
آں مے کہ چو زنجیر بہ پیچد بر خود — دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ
نہ لائق مسجدم نہ در خورد کنشت — ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
نہ دین و دنیا و نہ امید بہشت — چوں کافر درویشم و چوں قحبہ زشت

دین دنیا دونوں سے محروم ہونے کی اس سے اچھی کوئی تمثیل نہیں مل سکتی، کافر، فقیر اور بد صورت قحبہ، یہ دونوں دین و دنیا کسی سے بہرہ یاب نہیں،

**دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی** دنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعرا کا سب

بڑا موضوع ہے، سعدی، حافظ، ابن یمین، ناصر خسرو، سحابی نجفی کی تمام کائنات یہی ہے، اس مضمون کی ابتدا در حقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اس کو پہنچا دیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اُسی کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں، نصیحت سے قطع نظر خیام کے زورِ شاعری کا بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس نے سَو سَو دفعہ اس مضمون کو باندھا ہے، لیکن قوت تخئیل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کر دیتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے،

| | |
|---|---|
| خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے است | زُلف صنمے عارض جانانے است |
| ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے ست | انگشت وزیرے وسر سلطانی است |

شیخ سعدی نے اس مضمون کیلئے فرضی حکائتیں لکھی ہیں، مثلاً کہتے ہیں،

| | |
|---|---|
| شنیدم کہ یک بار در دجلۂ | سخن گفت با عابدے کلّۂ |
| کہ من فر فرماندہی داشتم | بہ سر بر کلاہِ مہی داشتم الخ |

ایک اور شعر میں نہایت درد انگیز طریقہ سے اس کو ادا کیا ہے،

| | |
|---|---|
| زدم تیشہ یک روز بر تل خاک | بگوش آمدم نالۂ دردناک |
| کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر | کہ چشم و بنا گوش و روی است وسر |

یعنی میں نے ایک دن مٹی کے ایک تودے پر پھاوڑا مارا، میرے کان میں دردناک آواز آئی کہ میاں ذرا آہستہ، یہاں آنکھیں ہیں، کان ہیں، چہرہ ہے، سر ہے (ان کو چوٹ نہ لگ جائے) لیکن سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں، خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں، ملاحظہ ہو،

| | |
|---|---|
| دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار | بر تازہ گلے لگد ہمی زد بسیار |
| واں گِل بزبان حال با او می گفت | من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار |

سعدی کے شعر میں اگرچہ "آہستہ تر" اور اعضا کے مفرد ناموں نے ایک خاص اثر پیدا کیا ہے، لیکن طلب رحم کی علت خیام کے ہاں زیادہ قوی ہے، یعنی یہ کہ میں بھی تمہاری ہی طرح تھا اسلئے مجھ سے یہ سلوک نہ کرو، اس سے بھی زیادہ مؤثر طریقہ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

| | |
|---|---|
| پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است | گردندہ فلک برائے کارے بودہ است |
| زنہار قدم بخاک آہستہ بنہ | کیں مردمکِ چشم نگارے بودہ است |

اسی مضمون کے اور پیرائے دیکھو،

این کہنہ رباط را کہ عالم نام است
آرامگہ ابلق صبح و شام است
بزمے است کہ واماندۂ صد جمشید است
قصرے است کہ تکیہ گہہ صد بہرام است

خوش باش کہ غصّہ بیکراں خواہد بود
بر چرخ قران اختراں خواہد بود
خشتے کہ ز قالب تو خواہند زدن
ایوان وسرائے دیگراں خواہد بود

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری
تا چند کنی بر گل آدم خواری
انگشت فریدوں وکف کیخسرو
بر چرخ نہادۂ چہ می پنداری

یعنی اے کمہار کچھ جانتا ہے تُونے چاک پر کیا چڑھا رکھا ہے، فریدوں کی انگلی اور کیخسرو کی ہتھیلی،

جامے است کہ عقل آفریں میزندش
صد بوسہ ز مہر بر زمین میزندش
ویں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف
می سازد و باز بر زمین میزندش

بر سنگ زدم دوش سبوئی کاشی[1]
سرخوش بودم کہ کردم ایں اوباشی
با من بزبانِ حال می گفت سبو
من چوں تو بدم تو نیز چوں من باشی

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است
واندر طلب روے نگارے بودہ است
ایں دست کہ بر گردنِ اومی بینی
دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

خمریات | جس طرح عربی زبان میں ابونواس شراب کا جاندادہ ہے، فارسی میں خیام دور جام کا ستم زدہ ہے، وہ جس شغف، جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری اور جوش سے شراب کا نام لیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا، اور یہی ظاہری شراب پیتا تھا، افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا، ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شرابِ معرفت بن جاتی ہے،

خیام کا آدھا کلام شراب ہی کے ذکر میں ہے، اکثر مضامین اور خیالات جو اُس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے اُن ہی کو لے کر زیادہ شوخ کر دیا ہے، تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بیخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اب بھی اس حد تک نہیں پہنچے،

من بے مے ناب زیستن نتوانم
بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید
یک جام دگر بگیر و من نتوانم

مائیم خریدارِ مے کہنہ و نو
وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو

---

[1] یعنی شہر کاشی کا بنا ہوا گھڑا،

گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت
مے پیش من آرد ہر کجا خواہی رو

اس سرمستی اور بے اعتنائی کو دیکھو، ایک شخص مذہبی خیالات میں ڈوبا ہوا قیامت کے حالات کا متجسّس ہے، خیام کے پاس آتا ہے اور نہایت تردد اور تفحص کے لہجہ میں پوچھتا ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ وہ کس بے تکلفی سے جواب دیتا ہے کہ میاں شراب لاکر میرے سامنے رکھ دو اور جہاں جی چاہے جاؤ (مجھ کو کیا غرض)

باایں ہمہ زیادہ تحقیق و تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام اگر شراب پیتا بھی تھا، تو رندانہ نہیں بلکہ حکیمانہ پیتا تھا، اگرچہ شرعاً یہ بھی ممنوع اور حرام ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب پینے میں ان باتوں کا لحاظ شرط ہے، کس کو پینی چاہیئے؟ کتنی پینی چاہیئے؟ کن لوگوں کی صحبت میں پینی چاہیئے؟ ان شرطوں کا لحاظ رکھا جائے، تو ثابت ہوگا کہ عقلمند کے سوا اور کوئی شراب پی نہیں سکتا، اس لئے کہ عقلمند ہی ان شرائط کا لحاظ رکھ سکتا ہے۔

مے گرچہ حرام است ولے تا کہ خورد
آنگاہ چہ مقدار؟ و دگر با کہ خورد؟

ہر گاہ کہ ایں چہار شرط آید جمع
پس مے نخورد مردم دانا کہ خورد

پھر صاف صاف بتاتا ہے کہ کس طرح پینی چاہیئے؟

کم کم خور و گہ گہ خور و تنہا مے خور

چوں ہشیارم، طرب زمن پنہان است
در مست شوم، در خردم نقصان است

حالے است میانِ مستی و ہشیاری
من بندۂ آنکہ زندگانی آن است

یعنی شراب کی نہ وہ حالت پسندیدہ ہے، جب انسان مست ہو جائے نہ یہ کہ مطلق اثر نہ پڑے، مستی اور ہشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہے، اور میں اسی کا غلام ہوں۔

چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو
مدہوش مباش، و جہل راخانہ مشو

خواہی کہ مے لعل حلالت باشد
آزار کسے مجوئے و دیوانہ مشو

---

گر بادہ نمی خورم نشان خامی است
ور نیز مدام میخورم بدنامی است

مے شاہ و حکیم و رند باید کہ خورد
ور زیں سہ نہ، مخور کہ دشمن کامی است

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شراب پینی گو اعتدال ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہر حال میں حرام ہے، اور جو شخص جواز کا فتویٰ دیتا ہے، سخت اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن اگر تمہارے سامنے دو شخص آئیں، ایک نیک طینت، بے ریا، سچا، دیانت دار ہے، لیکن شراب پیتا ہے،

دُوسرا شراب نہیں پیتا، نماز و روزہ بھی ادا کرتا ہے، لیکن رات دن تکفیر، بدگوئی اور غیبت میں مصروف رہتا ہے، وقف کے مال پر شرعی حیلوں سے تصرف کرتا ہے، احکام شرعیہ کو اپنی خواہش کے موافق ڈھالتا رہتا ہے تو تم ان دونوں میں سے کس کو پسند کروگے؟ غور کرو جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ شراب سے زیادہ گناہ کس بیباکی سے کرتے ہیں، خیام ان لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے،

صد کار کنی کہ مے غلام است اورا  تو فخر ہمی کنی کہ مے می نہ خوری

خواجہ حافظ نے اسی نکتہ کو نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے،

کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است  فقیہِ مدرسہ دی مست بود فتویٰ داد

**فلسفہ** فلسفہ کیا چیز ہے؟ "حقائق اشیاء کا ادراک" ہمارے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے اُن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چیزیں ہیں؟ کیونکر وجود میں آئیں، کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں یا مرکب، ان کے ذاتیات کیا ہیں؟ خواص کیا ہیں؟ پھر ہم چند چیزوں کو ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے وجود میں آتا دیکھتے ہیں اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کوئی باہم خاص تعلق ہے؟ یا اتفاقیہ ان کا ساتھ ہو گیا ہے؟ تعلق ہے تو کس قسم کا ہے؟ کیا نوعیت ہے؟ کیوں ہے؟ غرض یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات ہیں فلسفہ کا مایۂ خمیر ہیں، اور ان کا جواب دینا فلسفہ کا فرض ہے، لیکن ان سب سوالوں سے مقدم یہ سوال ہے کہ کیا ہم اشیاء کی حقیقت کو جان سکتے ہیں؟ عموماً تمام حکما اس کا جواب اثبات کی صورت میں دیتے ہیں، لیکن ہر زمانہ میں ایسے حکماء بھی ہوتے آئے ہیں، اور اب بھی ہیں، جن کی رائے ہے کہ کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، ہربرٹ اسپنسر نے تمام اشیاء کی دو قسمیں کی ہیں، ۱ وہ چیزیں جو فوق الادراک ہیں، اور انسان کے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں، ۲ وہ چیزیں جو تحت ادراک ہیں پہلی قسم پر اُس نے ایک خاص رسالہ لکھا ہے، اور بتا دیا ہے کہ ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، شاپن ہور (جرمن کا فلسفی) سرے سے انکار کرتا ہے، یعنی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، خیام کا بھی یہی مذہب ہے، غور کرو، اور خوب غور کرو، جن چیزوں کی نسبت ہم کو یقین ہے کہ ہم جانتے ہیں، ان کو بھی ہم کیا جانتے ہیں، سب سے زیادہ محسوس بدیہی، اور نمایاں مادہ یا جسم ہے، لیکن غور سے دیکھو، مادہ کو ہم کس حد تک جانتے ہیں، ہم مادہ کے چند خواص جانتے ہیں، ہم جانتے ہیں، کہ مادہ تحلیل ہوتے ہوتے، ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا تک منتہی ہوتا ہے، جو پھر تحلیل نہیں ہو سکتے، اور ان کو اجزائے دیمقراطیسی کہتے ہیں، ان اجزا میں

حرکت، وزن، کشش انفصالی، کشش ثقل اور چند خواص پائے جاتے ہیں، لیکن یہ اجزا کے خواص اور اعراض ہیں، ان کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئے کہاں سے آئے؟ یہ چیزیں بالکل غیر معلوم ہیں، اس سے بھی زیادہ صاف مثال میں سمجھو، ہم نے ایک سیب ہاتھ میں لیا، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کو جانتے ہیں، اور بداہۃً جانتے ہیں، لیکن غور کرو، ہم کیا جانتے ہیں: ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص مقدار رکھتا ہے، اس میں خوشبو ہے، رنگ ہے، مزہ ہے، لیکن ساخت خوشبو، رنگ، مزہ یہ سب تو اوصاف ہیں جن کو قدیم فلسفہ کی زبان میں عرض کہتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز جوہر قائم بالذات نہیں، حالانکہ سیب قائم بالذات چیز ہے، اس لئے ہم کو سیب کی اصلی حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی،

علّت و معلول کا سلسلہ جو ہم کسی چیز میں قائم کرتے ہیں جس قدر تحقیقات بڑھتی جاتی ہے، یہ سلسلہ ناقابل اعتبار ثابت ہوتا جاتا ہے، اور پھر اصلی علت کا پتہ نہیں لگتا، اوپر سے جو چیز گرتی ہے، زمین پر آتی ہے، یونانی حکماء کی حقیقت کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ان چیزوں کا مرکز کی طرف کھنچتی ہے، لیکن نیوٹن نے اس کی غلطی ثابت کی، اور بتایا کہ تمام اجسام میں جذب کی خاصیّت ہے، اور چونکہ زمین بڑا جسم ہے، اس لئے وہ اپنے سے چھوٹے تمام اجسام کو اپنی طرف جذب کرتا ہے، لیکن اس سے اصل مسئلہ کیا حل ہُوا، اس قدر بے شُبہ معلوم ہُوا کہ اُوپر سے گرنے کی علّت تجاذب اجسام ہے، لیکن تجاذب اجسام کی کیا علّت ہے، یعنی اجسام میں جذب کی خاصیت کیوں ہے؟ یہ مسئلہ اب بھی اسی طرح لاینحل ہے، غرض اسی طرح درمیانی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اُوپر چل کر، پھر وہی لاعلمی پیش آتی ہے، ایک راز کُھلتا ہے تو دُوسرا راز پیدا ہوتا ہے، ایک گرہ کُھلتی ہے، تو دوسری گرہیں پڑ جاتی ہیں،

فلسفی سرّ حقیقت نتوانست کشود　　گشت رازِ دگر آں راز کہ افشاء مے کرد

اسی بنا پر دقیق النظر حکماء کا یہی مذہب ہے، کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، سقراط نے تمام عمر کی تحقیقات کے بعد یہی کہا "معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"؛ خیام کا بھی یہی مذہب ہے، خیام نے اس رائے کو نہایت صراحت اور نہایت کثرت سے بیان کیا ہے،

کس مشکلِ اسرارِ فلک را نکشاد　　کس یک قدم از نہاد بیروں نہ نہاد
چوں بنگرم از مبتدیٔ تا اُستاد　　عجز است بدست ہر کہ از مادر زاد
آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند　　در کشفِ دقیقہ شمعِ اصحاب شدند

رہ زین شب تاریک نبردند بروں — گفتند فسانۂ و درخواب شدند

آنہا کہ جہاں زیر قدم فرسودند — واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز — زین حال چناں کہ ہست آگہ بودند

جمعے متفکرند در مذہب و دین — جمعے متحیرند در شک و یقین
ناگاہ منادے بر آید ز کمیں — کائے بیخبراں راہ نہ آنست و نہ این

افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شد — در دستِ اجل بسے جگر باخون شد
کس نہ آمد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو — کاحوال مسافران عالم چوں شد

ہر چند کہ رنگ و بوی زیباست مرا — چوں لالہ رُخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک — نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد — وز سرّ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز قیاس خویش چیزے گفتند — معلوم نہ گشت و قصّہ کوتاہ نہ شد

دل سرّ حیات را کماہی دانست — در موت ہم اسرار الہٰی دانست
امروز کہ باخودی ندانستی ہیچ — فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

تم کو خیال ہوگا کہ اگر لاعلمی ہی خیام کا فلسفہ ہے، تو جتنے جاہل ہیں، سب فلسفی ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، سقراط سے لوگوں نے کہا کہ جب تم بھی کچھ نہیں جانتے اور ہم بھی نہیں جانتے تو ہم میں تم میں کیا فرق ہے، اُس نے کہا صرف یہ کہ مَیں یہ جانتا ہُوں کہ میں نہیں جانتا اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم نہیں جانتے،

علم عموماً دو قسم کا ہوتا ہے، عالمانہ و جاہلانہ، زمین، آفتاب، ماہتاب، ان سب چیزوں کو ایک گنوار بھی جانتا ہے، لیکن جاہلانہ جانتا ہے، ایک کسان بھی جانتا ہے، کہ ایک زمین میں ایک وقت دو اناج پیدا نہیں ہو سکتے، اسی کو علم نباتات کا ایک عالم بھی جانتا ہے، لیکن دونوں کے جاننے میں کس قدر فرق ہے، لاعلمی کا بھی یہی حال ہے، ایک فلسفی بھی جانتا ہے، کہ وہ خدا کی حقیقت کو نہیں جان سکتا، ایک جاہل بھی اس کا اقرار کرتا ہے، لیکن دونوں میں کس قدر فرق ہے،

خیام کو اس لاعلمی پہ ناز ہے، اور کہتا ہے کہ ہر شخص اس لاعلمی کے رُتبہ تک نہیں پہنچ سکتا،

تو بے خبری بے خبری کار تو نیست — ہر بے خبرے را نہ رسد بے خبری

اسی کو ایک اور شاعر نے شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بجائے رسیدہ دانش من   کہ بدانم ہمے کہ نادانم ،

یعنی میرا علم اب اس درجہ پہنچ گیا ہے، کہ یہ جانتا ہوں کہ مَیں نہیں جانتا،
ایک اور موقع پر خیام کس ادعا سے کہتا ہے،

رندے دیدم نشستہ بر سنگِ زمیں   نہ کفر نہ اسلام نہ دُنیا و نہ دین
نے حق، نہ حقیقت، نہ شریعت، نہ یقین   اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ این

لاعلمی کا فلسفہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھو اس کا اثر کیا ہے،

ہر قسم کی تحقیقات، انکشافات، جدید اطلاعات کا سرچشمہ، یہی لاعلمی کا فلسفہ ہے، اگر ہم کو یقین ہو جائے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، یا جس چیز کو جانتے ہیں، اس کی تہ تک پہنچ گئے ہیں، تو علمی تجسس کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟ آئندہ ہم کو کیوں تلاش ہوگی ہم کیوں جدوجہد میں مصروف ہونگے؟ لاعلمی کا فلسفہ ہمارا شمعِ راہ ہے، وہ ہم کو ہر قدم پر آگے بڑھاتا ہے. ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں، اس کو نہ جاننا کہتے ہیں، اور آگے بڑھتے ہیں، خیام گویہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ تم کو کچھ معلوم نہیں، لیکن معلوم کرنے کی خواہش کی ترغیب دلاتا ہے،

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت   از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت
بنگر چہ کسی؟ و از کجا آمدۂ؟   می داں کہ چہ میکنی؟ کجا خواہی رفت

تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنے کی تلقین کرتا ہے، ان سے بڑھ کر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں؟

ایک اور نکتہ نہایت غور کے قابل ہے، اسلامی بے شمار فرقوں کو دیکھو، ان کے باہمی مسائل مختلفہ کیا ہیں؟ خدا فاعل بالایجاد ہے، یا بالارادہ؟ خدا کے صفات عین ذات ہیں یا خارج؟ قدیم ہیں یا حادث؟ خدا کا کلام نفسی ہے یا لفظی؟ یہ مسائل کس قدر فوق الادراک ہیں، جب خدا کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو یہ کیا معلوم کہ اس کے اوصاف کیا ہیں، بااین ہمہ ہر فرقہ کو قطعی یقین ہے کہ اس کو جو کچھ معلوم ہے قطعی ہے، اور اس قدر قطعی ہے، کہ جو شخص اس کے خلاف کہتا ہے وہ گمراہ ہے، جاہل ہے، کور باطن ہے، مُرتد ہے، کافر ہے، ملعون ہے، معتزلہ، قدریہ، اشعریہ، حنابلہ، شیعہ، سُنّی، سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچتی ہے اور بغداد کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں،

اگر ان بزرگوں کو خیام کے فلسفہ پر عمل ہوتا. یعنی یہ کہ یہ مسائل فوق الادراک ہیں، ہم جس قدر

جانتے ہیں، نہ جاننے کے برابر ہے، مذہبی حیثیت سے ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اجمالی ایمان لائیں یعنی یہ کہ خدا ہے، جانتا ہے، دیکھتا ہے، سُنتا ہے، بولتا ہے، باقی یہ تدقیقات کہ ان اوصاف کی حقیقت کیا ہے، اس کی ہم کو شارع نے تکلیف نہیں دی، تو آج بارہ سو برس سے مسلمانوں کے فرقوں میں جو نزاعیں جنگ وجدل، معرکہ آرائیاں، اور خونریزیاں ہوتی رہیں کیوں ہوتیں،

ہاتفِ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے،

یکے از کفر لافد وگر طامات می بافد | بیا کایں داوریہا را ابہ پیش دوراندازیم

**جبر** یعنی انسان کا مجبور ہونا، جبر ایک دقیق مسئلہ ہے اور گو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی مفر نہیں، قدریہ کا تمامتر زورِ استدلال ارادہ پر ہے یعنی یہ کہ انسان کا ارادہ اُسکے اختیار میں ہے، اسلئے انسان مختار ہے، لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ بھی اُس کی اختیاری چیز نہیں، ارادہ کے جب تمام اسباب جمع ہو جائیں گے، ارادہ خواہ مخواہ پیدا ہوگا اس کا روکنا یا نہ پیدا ہونے دینا انسان کے اختیار میں نہیں،

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ جبر کے نام سے بھاگتے ہیں، اور جبریہ کو کافر بتاتے ہیں خود جبریہ ہیں، لیکن مُنہ سے اقرار نہیں کرتے، اشاعرہ جبر کے قائل نہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ "انسان کو اپنے افعال پر قُدرت ہے" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں، کہ "یہ قدرت مطلقاً کچھ اثر نہیں رکھتی، تو پھر ایسی قُدرت سے کیا فائدہ؟ اسی بنا پر مُسلّم الثبوت میں لکھا ہے کہ اشاعرہ کا کسب، اور جبریہ کا جبر دونوں توام بھائی ہیں" بہرحال ہم اس بحث کا فیصلہ نہیں کرتے، جبر صحیح ہو یا غلط خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا،

ایزد چو نخواست آنچہ من خواستہ ام | کے گردد راست آنچہ من خواستہ ام
گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است | پس جملہ خطا است آنچہ من خواستہ ام

نقشے است کہ بر وجود ما ریختۂ | صد بو العجبی ز ما برانگیختۂ
من زاں بہ ازیں نمی توانم بودن | کز بوتہ چنیں مرا فرو ریختۂ

از آب و گلم سرشتہ من چہ کنم | وین پشم و قصب تو رشتہ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود | تو بر سرِ من نوشتہ من چہ کنم

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی | دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی | کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

انہی خیالات کو خواجہ حافظ نے عجیب عجیب پیرایوں میں ادا کیا ہے،

برو اے زاہد، دعوت نکنم سوئے بہشت — کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

**فلسفۂ زندگی**

خیام کا فلسفۂ زندگی بظاہر ایپیکورس کی آواز بازگشت ہے، یعنی یہ کہ گزشتہ اور آیندہ سے کچھ بحث نہیں، جو کچھ ہے حال ہے، اس میں کھاؤ، پیو، خوش رہو، دگر ہیچ مصرعہ "چنیں نماند، چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

در وقت بہار اگر بتے حور سرشت — پر مے قدحے دہد، مرا بر لب کشت
گرچہ بہر کس این سخن باشد زشت — سگ بہ ز من ار دگر برم نام بہشت

یک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت — این جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومے بہ بہشت و دوزخ اندر گروند — کہ رفت بدوزخ؟ و کہ آمد ز بہشت

روزے کہ گذشتہ است از و یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن — حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

از درس علوم جملہ بگریزی بہ — و اندر سر زلف دلبر آویزی بہ
زاں پیش کہ روزگار خونت ریزد — تو خون پیالہ در قدح ریزی بہ

زاں پیش کہ بر سرت شبیخوں آرند — فرمائی کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نہ اے غافلِ ناداں کہ ترا — در بوتہ نہند و باز بیروں آرند

ایں عقل کہ در راہ سعادت پوید — روزے صد بار خود ترا می گوید
دریاب تو ایں یکدمہ فرصت کہ نۂ — آں ترہ کہ بدروی و آخر روید

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت — در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت
مے نوش ندانی از کجا آمدۂ — خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

مائیم خریدار مے کہنہ و نو، — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت — مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے، مزے اڑائے، بظاہر نہایت خطرناک ہے، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہو سکتی، اس نے بہت سی رباعیوں میں معاد اور جزا و سزا کا اقرار کیا ہے، اور نکوکاری اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے، ایشیائی سلطنتوں میں، جاہ و مال کے حاصل کرنے میں جن ذلیل، کمینہ، ناجائز اور ناپاک ذریعوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس کا اندازہ ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا، کم سے کم اس کے لئے

کسی ہندوستانی ریاست کا سفر کرنا چاہئے، خیام کے سامنے زندگی کا جو نمونہ موجود تھا، وہ یہی تھا کہ ارباب دُنیا رات دن جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی، نفاق، خوشامد، تگ ودَو اور ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، پھر ان سب مصیبتوں سے جو چیز حاصل کرتے تھے، وہ کس قدر ناقابلِ اعتبار اور سریع الزوال ہوتی تھی، آج ایک شخص وزیر اعظم ہے، کل در بدر مارا مارا پھرتا ہے، کل تک ایک شخص تاج و تخت کا مالک تھا، آج مسجد کے دروازہ پر گداگری کر رہا ہے، برامکہ نے ابھی تمام عالم کو چھا لیا ہے، ابھی خاندان کا خاندان برباد ہو کر نام و نشان تک مٹ گیا، ابو الفضل کل تک ندیمِ خاص تھا، آج دربار میں اس کا سر کٹ کر آرہا ہے،

ان حالات کو دیکھ کر بے شبہ ایک فلسفی گھبرا اُٹھے گا اور کہے گا کہ دُنیا ناقابلِ اعتبار ہے، جاہ و منصب کوئی چیز نہیں، خود زندگی کس قدر ہیچ ہے، فریدوں کی خاک سے کمہار کے برتن بنتے ہیں، جمشید کا کالبد، خشت سازی کے کام میں آتا ہے، اس لئے تگ و دَو اور تردد و فکر بیکار ہے، تھوڑی سی زندگی ہے، اس کو قناعت، خاموشی و سکون اور اطمینان کے ساتھ گزار دو، کھاؤ، پیؤ، خوش رہو اور خوشی خوشی دنیا سے چلے جاؤ،

خیام اس بات سے واقف ہے کہ اس قسم کے قانع شخص کو عام لوگ ذلّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس پر تعجب کرتا ہے،

این جمع اکابر کہ مناصب دارند — از غُصّہ و غم زجانِ خود بیزارند
وانکس کہ اسیرِ حرص چوں ایشاں نیست — ایں طرفہ کہ آدمیش می نہ شمارند

نہایت خوبی سے وہ قناعت اور آزادی کی تعلیم کرتا ہے،

چوں رزق تو انچہ عدل قسمت فرمود — یک ذرّہ نہ کم شود نہ خواہد افزود
آسودہ ز ہرچہ نیست می باید شد — وآزادہ ز ہرچہ ہست می باید بود

خواہی کہ ترا تربیت اسرار رسد — مپسند کہ کس راز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور — کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

خیام جس زندگی کو قابلِ رشک سمجھتا ہے، وہ یہ ہے،

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد — وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے — گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابن یمین نے اس زندگی کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے،

دو تائے ناں اگر از گندم ست یا از جو | دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود، بخاطر جمع | کہ کس نگوید از ینجا بخیز و آں جا رو
ہزار بارہ فزوں تر بہ نزد ابن یمیں | ز فر مملکتِ کیقباد کیخسرو

**اخلاقی تعلیم** خیام کا فلسفۂ اخلاق نہایت مختصر ہے، لیکن جس قدر ہے، اس مختصر سی دُنیا کے لئے کافی ہے،

غیبت مکن و دل کساں را مآزار | در عہدۂ آں جہاں منم، بادہ بیار
بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد | یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نرسد
من نیک تو خواہم و تو خواہی بد من | تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد
گر شادی ازاں خویشتن مے دانی | کاسودہ دے را بہ غمی بنشانی
در ماتم عقل خویش بنشیں ہمہ عمر | پندار مصیبت کہ عجب نادانی
اے آنکہ خلاصۂ چہار ارکانی | بشنو سخنے ز عالمِ روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی | باتست، ہرانچہ می نمائی آنی

یعنی تم شیطان، درندہ، فرشتہ، انسان، سب کچھ ہو سکتے ہو، اب جو چاہو، ہو جاؤ، تم کہو گے کہ یہ ایسی کیا اچھوتی تعلیم ہے، سب اہل مذہب، اسی کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں یہ سچ ہے لیکن اہلِ مذہب نے اپنی فیاضی کا دائرہ محدود کر دیا ہے، اُن کے نزدیک نیکی، احسان، بھلائی ہمدردی، غمخواری، ان تمام اوصاف کا محل صرف اپنے ہم مذہب ہیں، لیکن خیام کے نزدیک آفتاب کی روشنی دشت و چمن، دونوں پر یکساں پڑتی ہے،

خیام کی اخلاقی تعلیم میں ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے، اور اس نے جس خوبی سے اسکی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی، سعدی اور حافظ ریاکار زاہدوں اور پیشواؤں کی دھجیاں اُڑانے میں نہایت نامور ہیں اور نہایت عجیب عجیب نادر پیرایوں میں ان لوگوں کے پترے کھولے ہیں، لیکن خیام نے ایک رباعی میں اس مضمون کا خاتمہ کر دیا ہے،

زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی | بنگر زکہ بگسستی و چوں پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمائم ہستم | تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

یعنی ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے، تو خیال نہیں کرتی، کہ تو نے کس چیز کو چھوڑا، اور کس چیز کو اختیار کیا ہے، اُس نے جواب دیا کہ میں تو جیسا اپنے

آپ کو ظاہر ہیں دکھلاتی ہوں ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں، ایسے ہی حقیقت میں بھی ہیں،

ظاہر و باطن کے یکساں نہ ہونے کی بُرائی کا پیرایہ اس سے زیادہ اچھوتا، نادر اور مؤثر و عبرت خیز نہیں ہو سکتا تھا، خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا، کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے، اس لئے وہ ان موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے"

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند | با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا | در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

یعنی رستہ اس طرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو، کہ لوگ تمہاری تعظیم کے لئے قیام نہ کریں، مسجد میں جاؤ تو اس طرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں، مطلب یہ کہ ایسی سادگی، بے تکلفی، خاموشی سے زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو مقدس نہ خیال کریں، یہ ظاہر ہے کہ انسان جب لوگوں کی نظر میں مقدس ہو جاتا ہے تو اس کو سینکڑوں باتیں ایسی کرنی پڑتی ہیں جن سے اس کا تقدس قائم رہے، حالانکہ وہ باتیں بہ تکلف کرتا ہے، اگر اس منصب پر وہ نہ پہنچتا تو اس خود داری اور حفظِ مراتب کی اس کو کیا ضرورت تھی،

خیام کا فلسفۂ اخلاق زہاد اور علماء کے فلسفۂ اخلاق سے نہایت بلند ہے، یہ مقدس گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، ان لوگوں کو اگر اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اس فعل پر عذاب نہیں ہوگا، یا خدا اُس کو بخش دے گا، تو پھر ان کو کچھ پروا نہ ہوگی، خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہے کہ خود یہ کام کیسا ہے، اگر وہ کام بُرا ہے تو اس سے اس کو کچھ تسلی نہیں ہوتی، کہ خدا اس کو بخش دے گا، اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے کہ خدا دیکھ رہا تھا، اور اس نے جُرم کا ارتکاب کیا،

با نفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم | وز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم
گیرم کہ ز من در گزرانی بہ کرم | زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا! میں نے مان لیا کہ تو میرا گناہ معاف کر دے گا، اور عذاب نہ دے گا لیکن یہ کیا کم عذاب ہے کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا،

**فقہا کی نسبت خیام کی رائے** خیام کے فلسفہ، اخلاقی تعلیم اور آزادی خیال کا نمونہ تم نے دیکھا، ایسا شخص فقہا کی نسبت جو رائے رکھ سکتا ہے، تم خود سمجھ سکتے ہو، وہ کہتا ہے

اور کس قدر سچ کہتا ہے،

با این دو سہ نادان کہ چناں میدانی | از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خوش باش کہ از خری ایشاں بہ مثل | ہر گونہ خراست کافرش می دانند

غور کرو، امام غزالی، امام رازی، محی الدین عربی، شیخ الاشراق، ان میں سے ہر شخص فقہا کی تکفیر کا زخم خوردہ ہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ لوگ فقہا کے سے عامیانہ اور لغو عقائد اور خیالات نہیں رکھتے تھے، اسی نکتہ کو خیام اس تلخ جملہ میں ادا کرتا ہے، کہ جو شخص ان تکفیر کرنے والوں کی طرح سے گدھا نہیں ہے اس کو یہ لوگ کافر کہتے ہیں،

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپھولے توڑے، لیکن افسوس ہے، کہ فقہا کی سخت گیری کی وجہ سے وہ بھی اسرار اور حقائق کے ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکا چنانچہ خود کہتا ہے،

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست | گفتن نہ تواں کہ آں وبال سر ماست
چوں نیست دریں مردم دنیا اہلے | نتواں گفتن ہر انچہ در خاطر ماست

افسوس! ظاہر پرستوں کی گیرودار نے خدا جانے کتنے عجیب و غریب اسرار اور حقائق دلوں ہی میں دفن کرا دیئے، آج آزادی کا زمانہ ہے، لیکن اب وہ حقائق اور اسرار کہاں، بازاری اور عامیانہ باتیں زبان پر آئیں تو اس سے کیا حاصل!!!

انچہ در کار ست نتوانی تو گفت | انچہ می گوئی تو خود در کار نیست

**خیام اور یورپ** | یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدر دانی، ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی، اور کرنی چاہیئے تھی، خیام کے خیالات، یورپ سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بن جاتا،

عمر خیام کی نسبت ۱۸۹۶ء تک جو کچھ یورپ میں لکھا گیا وہ وصایا وغیرہ نہایت محدود ماخذوں سے تھا، مگر پروفیسر ژکوسکی (Zhukooski) کے قابل یادگار مضمون نے خیالات میں تغیر عظیم برپا کر دیا اور اب پروفیسر راس، ہیرن ایلن (Heyonallen) وغیرہ نے انگریزی میں عمدہ ترجمے اور تذکرے شائع کئے، ان سے پہلے انگلستان میں فٹز جیرلڈ (Fitizgerald) کے مشہور ترجمہ کے علاوہ میکارتھی (Mccorthy) نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا مگر گارنر (Garner) کا ترجمہ عالمانہ اور

مطلب خیز تھا، ون فیلڈ (Whinfield) نے ۱۸۸۳ء میں دو کتابیں ایک میں صرف ترجمۂ رباعیات اور دوسری میں رباعیاں اوران کے مقابل میں ترجمہ شایع کیں، نکلسن (Nicholason) فرانسیسی نے فٹز جیرلڈ سے ایک سال بعد فرنچ میں ایک ترجمہ شایع کیا تھا، باڈن اسٹیڈ (Bodenstedt) نے جرمن میں ایک ترجمہ چھاپا ہے، اور چند رباعیوں کا ترجمہ ہالینڈ کی زبان میں بھی ہوگیا ہے۔

پروفیسر لکھتے ہیں کہ اگر وہ تمام کتابیں اور رسالے جمع کئے جائیں، جن میں عمر خیام کا ترجمہ یا حال شایع ہؤا ہے تو درحقیقت ہماری زندگی میں یہ کام پورا نہیں ہوسکتا،

آکسفورڈ میں ایک نہایت قدیم نسخہ ہے، اس کو ہیرن ایلن نے عکس میں چھاپا ہے، ایک عمدہ نسخہ پیرس میں ہے، مگر آکسفورڈ والے سے پرانا ہے۔

# انوری

محمد نام، اوحدالدین لقب، انوری تخلص، ابیورد کے علاقہ میں بدہنہ ایک گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہؤا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع "انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز" اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے انوری نے پہلے اپنا تخلص خاوری رکھا تھا، پھر اپنے اُستاد عمارہ کی فرمائش سے بدل کر انوری کردیا،

انوری نے علوم وفنون کی تحصیل طوس کے مدرسہ منصوریہ میں کی، اور تمام درسی علوم و فنون حاصل کئے، ریاضی میں خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا، دولت شاہ کا بیان ہے، کہ انوری ایک دن مدرسہ کے دروازہ پر بیٹھا ہؤا تھا، کہ سامنے سے ایک شخص بڑے جاہ وتجمل سے گزرا، انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہؤا کہ پائے تخت کا شاعر ہے، انوری نے اسی وقت تعلیم وتعلم کو خیرباد کہا، اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا، جس کا مطلع یہ ہے،

گر دل و دست بحر و کاں باشد ۔۔۔ دلِ و دستِ خدایگاں باشد

صبح کو دربار میں جاکر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا، بہت محفوظ ہؤا، کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالاکر عرض کی،

جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست  سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر رادکان سے روانہ ہُوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کئے جن میں سے ایک یہ ہے،

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را  وین حال کہ نو گشت زمین را و زماں را

ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں، اس کو کبھی اُٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا انوری خود اس قصیدہ میں کہتا ہے،

خسروا! بندہ را چو دہ سال است  کہ ہمی آرزوئے آں باشد

کز ندیمانِ مجلس ار نہ شود  از مقیمانِ آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداءً نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے، انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعراء امیر معزی تھا، اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا، اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سُننے میں قصیدہ یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا تھا اور قصیدہ سُناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ تو میری تصنیف ہے چنانچہ قصیدہ کا قصیدہ خود پڑھ کر سُنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا، انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پُرانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر معزی کے پاس گیا، اور کہا کہ میں شاعر ہوں بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں، آپ پیش کرا دیجئے، معزی نے کہا کیا لکھا ہے، پڑھ کر سُناؤ، انوری نے پڑھا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ  زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یُوں کہتے تو مطلع ہو جاتا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ  زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنا ئیں گے، انوری سے کہا کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں گیا، اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ، انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا،

گر دل و دست بحر و کاں باشد    دل و دستِ خدائیگاں باشد
شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش    در جہاں بادشا نشاں باشد

دو شعر پڑھ کر رُک گیا، اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ یہ قصیدہ آپ کا ہے، تو باقی اشعار سُنایئے، معزی چُپ رہا، انوری نے پورا قصیدہ سُنایا، سنجر نہایت محظوظ ہُوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا[1]، رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال، دو دفعہ انوری کے مکان پر جاکر اس کی عزّت افزائی کی[2]،

انوری کو علم نجوم میں کمال تھا سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعۂ سیارہ بُرج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بناء پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرداب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر اُن میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اُس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گُل ہوتا، سنجر نے انوری کو بُلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے، فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا

گفت انوری کہ از جہت بادہائے سخت    ویراں شود عمارت و کہ نیز برسری
در سال حکم او نہ وزیداست ہیچ باد    یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترکِ ملازمت کر کے نیشاپور چلا آیا، اب اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امراء و رؤساء کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجیے، ۵۲۳ھ میں سلطان احمد بیروز شاہ نے اس کو خط بھیج کر بُلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہُوا، انوری یہ سُن کر کہ دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے، اِس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچ کر سلطان احمد سے معذرت چاہی، اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا، مطلب کی بات اس طرح ادا کی،

ایں حال کہ در بلخ کنوں دارم    از خوف پریشانی و گمراہی
زیں پیش اگر وہم و گماں بروے    آں مخطے کوتہ نظر شاہی
بر عبرۂ جیحوں نہ بہ آموزش    چوں بط بہ طبیعت شدمی راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے،

---

[1] نورہ، تفصیل تاریخ حبیب السیر میں ہے [2] خزانۂ عامرہ،

انوری روانہ ہُوا، لیکن دریائے جیحوں کے کنارے پہنچ کر اس کے اوسان جاتے رہے، رہبر جو ساتھ تھا، ڈھارس دلانے کے لئے لنگ باندھ کر دریا میں اترا، تیر تا ہُوا دور تک گیا اور چاروں طرف چکّر لگا کر دکھلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں، انوری بہ ہزار خرابی کشتی میں بیٹھا، گھاٹ پر شاہی اہتمام تھا، اور اسپ خاصہ سواری کے لئے آیا تھا، انوری نے آدابِ شاہی کے لحاظ سے گھوڑے سوار ہونے میں تامّل کیا، لیکن پیش خدمت کے اصرار سے سوار ہوا، اور دربار میں آیا، قصیدہ راہ میں لکھ رکھا تھا، دربار میں پہنچ کر پڑھا، دیکھو تمام واقعات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

حبذا بختِ مساعد کہ سوئے حضرتِ شاہ ۔۔۔ مرد می کرد و رہم داد پس از چندیں گاہ
اندر آمد ز در حجرۂ من صبح دمے ۔۔۔ روز بہمن جنہ یعنی دوم بہمن ماہ
سال پر پانصدوسی وسہ ز تاریخ عجم ۔۔۔ گفت برخیز کہ از شہر بدر شد ہمراہ
چہ روئے راہ تردد قضی الامر فقم ۔۔۔ چہ کشتی نقش تخیّل "بلغ السیل زباہ"
چوں برانگیخت مرا رفت چراغے افروخت ۔۔۔ بے تحاشی چو رفیقی کہ بود از اشباہ
تا کہ من جامہ بپوشیدم و بیروں رفتم ۔۔۔ بہ شتابے کہ دو اعم نہ رہی کرد نہ راہ
او بروں برد بدم فرش و آورد دستور ۔۔۔ محملے بست مرا کرد چو شاہے برگاہ
ہمچناں جملہ راہم بسلامت می برد ۔۔۔ نہ دراں طبع ملالت نہ دریں طوع اکراہ
تا بہ حدّے کہ مرا داد ہمے میخ و کفش ۔۔۔ تا بجائے کہ ہمی داد خرم را جو و کاہ (گھاس)
چوں بہ جیحوں برسیدیم ز من ہوش برفت ۔۔۔ گفت لاحول ولا قوت الا باللہ
رفت و برلست از اے وبہ جیحوں درجست ۔۔۔ وندراں جست بہ یکدم بگذشت او بشناہ
باز باز آمد و گفتا کہ بدیدی سہل است ۔۔۔ در نشیں، خیز و مکن وقت گذشتن بیگاہ
کشتی آورد و نشستیم در و ہر دو بہم ۔۔۔ چوں دو یار او ہمہ یاری دہ من یار خواہ
او چو شیرے بہ یکے گوشۂ کشتی بنشست ۔۔۔ من سر اندر زن[1] و بیروں زناں ہمچو روباہ
آخر الامر چو کشتی بسلامت بگذشت ۔۔۔ جستم از کشتی و آمد بہ لبِ کشتی گاہ
عرصۂ دیدم چوں جان و چو لائے بخوشی ۔۔۔ شادی افزائے چو جان و جوانی غم کاہ
گفتم اے بخت بہشت است سوادِ ترمد ۔۔۔ گفت راضی مشو از روضۂ رضوان بہ گیا

[1] سر اندر زدن، منہ اندر کر لینا، یعنی لومڑی کی طرح کبھی منہ باہر نکالتا تھا اور کبھی اندر کر لیتا تھا۔

باش تا شہر بہ بینی و دربار | باش تا قلعہ بہ بینی و درو عرض سپاہ
تا دریں بودم، گرد ے ز ور شہر نجاست | گفتم آں کیست مرا گفت جبینت کش شاہ
آمد القصّہ و آورد جبینت پیشم | دیدۂ من چو دراں شکل و شبہ کرد نگاہ
بوسہ دادم سُم و زانوئے ورکابش ہر سہ | گفتم اے روز براق از تو چو رنگ تو سیاہ
بہ سعادت بہ سر آخر خود باز خرام | کہ ترا پایہ بلند است و مرا پا کوتاہ
ایں ہمی گفتم و ادوست ہمی کوفت کہ نے | ترک فرماں ہمہ حال گناہ ہست و گناہ

اقسامِ سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ طبیعت میں تنک ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوُا اور اُس کی ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اُس نے سارے زمانہ کو دشمن بنالیا تھا، چنانچہ سلطان علاءالدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے، سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کرکے دربار میں بھیج دو، ملک طوطی نے فخرالدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ مَیں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں، فخرالدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا، اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا،

ھی الدنیا تقول بملاءِ فیھا | حذار حذار من بطشی وفتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوُا، ملک طوطی کے دربار میں سفارشیں پہنچائیں، سلطان علاءالدین کو یہ حال معلوم ہوُا تو اُس نے ملک طوطی کو لکھا کہ انوری کو میرے دربار میں بھیج دو، ہزار بکریاں صلہ میں دونگا، ملک طوطی نے انوری کو بُلا کر کہا کہ تمہارے معاوضہ میں مجھ کو ہزار بکریاں ملتی ہیں، انوری نے کہا علاءالدین مجھ کو ہزار بکریوں کے بدلے خریدتا ہے، اور آپ مفت بھی نہیں لیتے، ملک طوطی کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اپنے مقربین میں داخل کیا،[1]

انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھکر اسکے نام سے مشہور

---

[1] لب اللباب عوفی یزدی و مجمع الفصحا تذکرۂ فخرالدین مروزی۔

کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا تھا، چنانچہ جب وُہ بلخ میں آیا، تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کردی، اسکے چند اشعار یہ ہیں،

چار شہر ست خراساں را بہ چار طرف | کہ وسط شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خراب ہمہ مردم دارد | نہ چناں ہست کہ آبستنِ دام و دد نیست
بلخ را عیب اگرچند باد باش کنند | بر ہر ہیجِ دے نیست کہ صد بخرد نیست
مصر جامع را چارہ بنو داز بد و نیک | معدنِ زر و گہر بے سرب و بسّد نیست
حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے | گر بہشت است ہمیں ست وگرنہ خود نیست

اہلِ شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچی، لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے، اور جن کی شان میں انوری نے لکھا ہے،

بہ مدح و ثنا گر کنم رائے نظمے | نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی | اگر دمے باشد ہراساں فرستم

اُنہوں نے انوری کی حمایت کی اور اس کی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدہ میں ذکر کیا ہے،

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین، حسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدہ میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اس کی ہجو کیونکر کہہ سکتا ہوں،

بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی، اور گوشہ گزیں ہو کر بیٹھا، سلطان علاء الدین غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا،

کلبۂ کاندر و بہ روز و بہ شب | جائے آرام و خورد و خواب من است
جائیکے دارم اندراں کہ از و | چرخ در عین رشک و تاب من است
ہرچہ در مجلس ملوک بود | ہمہ در کلبۂ خراب من است

---

لہ مجمع الفصحا، تذکرۂ فتوحی مروزی و ریاض العارفین، تذکرۂ انوری، دولت شاہ نے لکھا ہے، کہ خود انوری نے یہ ہجو لکھی تھی، لیکن یہ غلط ہے ؛

رحل اجزا و نان خشک درو — گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش — زخمۂ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانہ اطلس — از ہزار اطلس انتخاب من است
ہر چہ بیروں بود ازیں کم و بیش — حاش للسامعین عذاب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد — نہ ببازوے خاک و آب من است
زیں قدر راہ رجعتم بستہ است — آنکہ او مرجع و مآب من است
دریں طریق از نمائش است خطا — چہ کنم ایں خطا صواب من است
نیست ایں بندہ را زبان جواب — جامۂ و جائے من جواب من است

مدح اور ہجو کے ساتھ غزل کہنی چھوڑ دی، کسی نے پوچھا تو جواب دیا،

دی مرا عاشقے، گفت غزل مے گوئی — گفتم از مدح و ہجا دست بیفشاندم ہم
گفت چوں؟ گفتمش آں جانب گمراہی بود — حالت رفتہ دگر باز نیاید ز عدم
غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں مے گفتم — کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

اخیر شعر کا مضمون اگرچہ عربی سے ماخوذ ہے، لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ انوری شاعری کی حقیقت سے واقف تھا، یعنی یہ کہ شاعری جذباتِ انسانی کے اظہار کا نام ہے، شہوت، حرص، غصہ، سب جذبات ہیں، اور یہی جذبات غزل و مدح اور ہجو کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں،

انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی، اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا،

انوری بخلاف اکثر شعرا کے اکثر علومِ متداولہ میں کمال رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

گرچہ دربستم در مدح و غزل یکبارگی — ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم
بلکہ بر علم کز اقرانِ من داند کسے — خواہ جزوی باشد آں را خواہ کلی قادرم
منطق و موسیقی و ہیئت شناسم اندکے — راستی باید بگویم با نصیب وافرم
وز الٰہی انچہ تصدیقش کند عقلِ صریح — گر تو تصدیقش کنی بر شرح و بسطش ماہرم
وز طبیعی رمز چند از چند بے تشویر ہست — کشف دانم کرد اگر حاسد نباشد ناظرم
نیستم ہم جاہلِ از اعمالِ احکامِ نجوم — ور ہمی باور نہ داری رنجہ شو من حاضرم
ایں ہمہ بگذار با شعر مجرد آمدم — چوں سنائی ہستم آخر گرنہ ہمچوں صابرم

قدر من صاحب قوام الدین حسن داند از انکه　　صدر او را یادگارِ ناصر الدین طاہرم

ان کمالات کی وجہ سے تمام لوگ اس کی عزّت کرتے تھے، سلطان سنجر اس جاہ وجلال کا بادشاہ اس کے گھر آتا تھا، فتوحات کا یہ حال تھا کہ جلال الوزرا کے ہاں سے سالانہ پانچ سَو اشرفیاں مقرر تھیں، با ایں ہمہ چونکہ طبیعت کا دنی تھا اور زبان قابو میں نہ تھی، اس لئے ذلّتیں اُٹھاتا تھا، ایک وزیر کی مدح میں قطع لکھا اور اخیر میں یہ شعر لکھے۔

توکہ از دُور ہمی بینی پوشیدہ مرا　　حال بیروں و درونم نہ ہمانا دانی

طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم زبروں　　وز درون پیرہن بوالحسن عمرانی

یعنی میرے بدن پر مدّت کے پھٹے پُرانے کپڑے ہیں، چادر ابوطالب کی دی ہوئی ہے، اور پیراہن ابوالحسن عمرانی کا عنایت کیا ہُوا ہے، وزیر نے ناراض ہوکر، فتوحی مروزی کو حکم دیا کہ جواب لکھے، چنانچہ اُس نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

از پسِ آنکہ بہ یک مہر دو الف ملکی　　داشت در بلخ ملک شاہ بتو ارزانی

وز پسِ آنکہ ہزار و گرت داد وزیر　　قرض آں پیر سرخشی زچہ می بستانی

از پسِ آنکہ زانعام جلال الوزراء　　بتو ہر سالہ رسد مہرے پانصد کانی

اے بہ دانائی معروف چرا میگوئی　　در ثنائے کہ فرستادۂ از نادانی

طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم زبروں　　وز درون پیرہن بوالحسن عمرانی

چہ بخیلی کہ بچندیں زر و سیم و نعمت　　طاق و پیراہنے دوخت ہمی نتوانی

پانزدہ سال فزوں باشد تا کُشتہ شدہ است　　بوالحسن آنکہ ز احسانش سخن میرانی

پیرہن کہنۂ او گرت بجائیست ہنوز　　پس مخواں پیرہنش کو زرہ خفتانی

باقی عمر بسِ اٰں پیرہن و طاق ترا　　سزدار ندہی ابرام و دگر بستانی

یعنی ابوالحسن عمرانی کو مرے ہوئے آج پندرہ برس ہوگئے، اتنی مدت تک اس کا دیا ہُوا پیرہن موجود ہے، تو پیرہن کاہے کو ہے زرہ ہے، اور اُس کے ہوتے اب کسی پیرہن کی کیا حاجت ہے؟"

**لطیفہ۔** ایک دفعہ انوری راہ میں چلا جاتا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ اشعار پڑھ رہا ہے انوری نے خیال کیا تو اُسی کے اشعار تھے، پُوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے؟ اُس نے کہا "انوری" انوری نے کہا، شعر کے چور پہلے بھی سُنے تھے، شاعر چُرانے والا آج دیکھا،

**کلام پر رائے** انوری جس پایہ کا شاعر تھا، اس سے زیادہ بہت خوش قسمت تھا، ایران میں تین

[1] مجمع الفصحا تذکرۂ فتوحی مروزی۔

شاعر پیغمبرِ سخن تسلیم کئے گئے، اُن میں ایک انوریؔ بھی ہے، چنانچہ مشہور ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لَا نبیَّ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسیؔ و انوریؔ و سعدیؔ

ہاتفیؔ نے مثنوی کی رعایت سے اس کو اس طرح بدل دیا ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند قولے است کہ جملگی برانند
فردوسیؔ و انوریؔ و سعدیؔ ہر چند کہ لَا نبیَّ بعدی

آباقاخاںؔ کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوریؔ اور ظہیر فاریابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے، سب نے مجدؔ ہمکر[1] کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا،

اے آں زمین وقار کہ بر آسمان فضل ماہ خجستہ فضلے و خورشید انوریؔ
جمعے ز ناقدانِ سخن گفتہ ظہیر ترجیح می نہند بر اشعارِ انوریؔ
جمعے دگر بریں سخن انکار مے کنند فی الجملہ در محلِ نزاع اند و داوری
رجحان یک طرف تو بدیشاں نما کہ ہست زیر نگیں طبع تو ملکِ سخنوری

مجدؔ ہمکر نے جواب لکھا،

جمعے ز اہلِ خطۂ کاشاں کہ بردہ اند ز ارباب فضل و دانش گوی سخنوری
کردند بحث در سخن نیشانِ نظم تا خود کہ سفتہ بہ دُر در سخنوری
در انوریؔ مناظرہ شاں رفت در ظہیر تا مر کراست پایۂ بہتر ز شاعری
انصاف چوں نیافت گروہ از دگر گروہ مر بندہ را گزید نظرِ شاں بہ داوری
در کانِ طبع آں چو بگشتم گراں گراں در قعر بحر ایں چو نمودم شناوری
شعر یکے بر آمدہ چو در شاہوار نظم دگر بر آمدہ چوں مہر خاوری
شعر ظہیرؔ اگرچہ بر آید ز جنسِ شعر بر تر ز انوریؔ نہ زند لاف شاعری
بر اوج مشتری نہ رسد تیر نظم او خاصہ کہ در ثناگری و مدح گستری
طعم رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق کے بہ بود ز خاصیت قند عسکری
اینست اعتقاد رہی خوش قبول کن گر تو مقیدِ سخن مجد ہمکری
زاد ایں نتیجہ نیم شب از آخر رجب در خاء و عین و دال ز ہجر پیمبری

---

[1] مجدؔ ہمکر اس درجہ کا شاعر تھا کہ بعضوں نے اس کو شیخ سعدی کا ہم پلہ مانا ہے؎

امامی[1] ہروی نے بھی اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

اے سالک مسالک فکرت دریں سوال ۔۔۔ معذور نیستی بحقیقت چو بنگری

تمیز راز بہر تناسب دریں دو طور ۔۔۔ ہیچ احتیاج نیست بدیں شرح گستری

کیں معجز[2] است واں سحر آں شمع وایں چراغ ۔۔۔ ایں ماہ آں ستارۂ و آں حور وایں پری

انوری ظہیر سے بلکہ اپنے تمام معاصرین سے بڑھ کر ہو تو ہم کو انکار نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں اس کو جگہ دی جائے، قطعہ مشہور اور مجدہمگر کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری قصیدہ گوئی میں پیغمبر تھا، جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں تھے، لیکن یہ اور بھی حیرت انگیز ہے، قصیدہ کا جو اندازہ چلا آتا تھا، اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا، اور جس قدر کیا اس میں اس کے اور ہمعصر شریک ہیں، انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے، مبالغہ کو ترقی دی، نئی تشبیہیں پیدا کیں، لیکن عبد الواسع جبلی، ارزقی اور ظہیر ان باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں، انوری نے ایک قصیدہ میں ہلال کی تشبیہ سے مدح کی طرف گریز کیا ہے، اور وہ انوری کے محاسن اشعار میں محسوب ہے،

دوش سلطان چرخ آئینہ فام ۔۔۔ آنکہ دستور شاہ راست غلام

از کنار نبرد گاہِ افق ۔۔۔ چوں بدست غروب داد زمام

دیدم اندر سوادِ طرۂ شب ۔۔۔ گوشوار فلک زگوشۂ بام

گفتم آں نعل خنگ دستور است ۔۔۔ قرۃ العین و فخر آلِ نظام

لیکن یہ تشبیہ اور گریز منطقی (گھوڑا وزیر) رازی سے ماخوذ ہے، وہ کہتا ہے،

مہ گردوں مگر بیمار گشتہ ۔۔۔ کہ نالید و تنش بگرفت نقصان

بسان گوے سیمیں بود اکنوں ۔۔۔ بر آمد بر فلک چو نوک چوگان

تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد ۔۔۔ فگند ایں نعل زریں در بیاباں

اس میں جو لطافت اور ندرت ہے انوری کے ہاں نہیں، ظہیر فاریابی نے بھی اس تشبیہ کو لیا ہے،

---

[1] یہ وہی امامی ہیں جن کو مجدہمگر نے شیخ سعدی پر ترجیح دی تھی اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا ؎

ہمگر بعمر خود نکردست نماز ۔۔۔ شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

[2] مجالس المومنین تذکرہ انوری، ہمگر کے قطعہ کے چند شعر ہم نے چھوڑ دیئے ہیں۔

لیکن چند اور تشبیہیں اضافہ کر کے اس کو زیادہ دلآویز کر دیا ہے،

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسمان — شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار
من با خرد بہ حجرۂ خلوت شتافتم — گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار
باز ایں چہ نقشِ بوالعجب و شکلِ نادر است — کز کارگاہِ غیب ہمے گرد و آشکار
گردوں نسجامۂ کہ؟ بریدہ است ایں طراز — گیتی ز ساعد کہ؟ بود است ایں سوار
گفت انچہ بر شمردی ازانجملہ ہیچ نیست — دانی کہ ہیچ با تو بگویم بہ اختصار
نعل سمند شاہ جہاں ست کاسماں — ہر ماہ بر سرش نہد از بہرِ افتخار

وطن کی ناقدری میں انوری کا مشہور شعر ہے،

بہ شہر خویش دروں بے خطر بود مردم — بہ کانِ خویش دروں بے بہا بود گوہر

لیکن یہ بالکل میر معزّی کے شعر کا سرقہ ہے،

مردم بہ شہر خویش نہ دارد بسے خطر — گوہر بہ کان خویش ندارد بسے بہا

غرض انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں، البتہ اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر، آزرقی، لامعی، رشید الدین وطواط، عبدالواسع جبلی، معزی وغیرہ سے بعض باتوں میں ممتاز ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعراء کی طرح اس کا کلام مدح پر محدود نہیں، وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے، جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہے، آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ میں، بندش میں، ترکیب میں، انوری کے سوا اور شعراء کے کلام سے بہت کم مدد ملے گی،

ایک قصیدہ میں شاعری کی بُرائی اور اُس کا غیر ضروری ہونا بیان کیا ہے، اس میں وہ تمام خیالات ظاہر کئے ہیں جو آج کل شاعری کے بیکار ثابت کرنے میں پیش کئے جاتے ہیں، اُس نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا رُتبہ حلال خور سے بھی کم ہے، اس لئے کہ حلال خور دُنیا کے لئے ضروری ہے، لیکن شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ادنیٰ سی چیز کے بنانے میں بواسطہ اور بلاواسطہ سینکڑوں آدمی کی شرکت کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن شاعر کون سا کام انجام دے سکتا ہے، مدحیہ شعر کہہ کر صلہ کا طالب ہونا کس قدر لغو ہے، ممدوح نے کب کہا تھا کہ تم اس کی مدح کرو، البتہ وہ شاعر قدر کے قابل ہے جو کسی کی مدح وغیرہ نہیں کرتا، ان تمام

خیالات کو انوری نے نہایت صفائی اور برجستگی سے ادا کیا ہے،

اے برادر بشنوی رمزی ز شعر و شاعری
تا نہ ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری

زانکہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست
حاش للہ تا ندانی ایں سخن را سرسری

زانکہ گر حاجت فتد تا فضلہ را کم کند
تا قلے باید، تو نتوانی کہ خود بیروں بری

کار خالد کے بجعفر مے شود ہرگز تمام
آں یکے جولاہگی داند دگر بذرگری

باز گر شاعر نباشد ہیچ نقصاں نا وفتد
در نظام عالم از روے خرد گر بنگری

آدمی را چوں مونت شرط کار شرکت است
ناں ز کناسی خوری بہ زاں بود کز شاعری

آں شنیدستی کہ سہ صد کس بباید پیشہ ور
تا تو نادانستہ وبے آگہی نانے خوری

در ازاے آں اگر از تو نباشد یارے
آں نہ ناں خوردن بود، دانی چہ باشد بدری

چوں نہ داری بر کسے حقی (مقابل) حقیقت داں کہ ہست
ہم تقاضا ریش گاوے ہم بجا

از چہ واجب شد بگو، آخر دریں آزار مرد
اینکہ میخواہی از و، یا آنکہ زو متکبری

اوترا کے گفت: کایں گلتیرہ ہا راجمع کن
تا ترا لازم شود چنداں شکایت گستری

عمر خود خود میکنی ضائع از و (لغویات) تاواں مخواہ
ہم تو حاکم باش تا ہم زاں کہ بفروشی خری

دشمن جان من آمد شعر چندش پرورم
اے مسلماناں فغاں از دست دشمن پروری

شعر دانی چیست؟ دور از روے تو حیض الرجال
قائلش گو خواہ جیواں باش خواہی مشتری

اینکہ پرسد ہر زماں ایں کون خر انگاؤ ریش
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری

راستی بہ بو فراس آمد نگار شاعراں
واں نہ از جنس سخن بل از کمال قادری

زانکہ ہمچوں دیگراں مدح و ثنا ہرگز نگفت
پس مرنج ار گویدت من دیگرم تو دیگری

مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیر دش
تا شفاے بوعلی خواند نہ ژاژ بحتری

جس زمانہ میں غزوں (تاتاریوں)، نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا، اور کئی برس تک قید میں رکھا تمام ملک میں بد امنی پھیل گئی، اہل خراسان نے احمد سلیمان سے استغاثہ کرنا چاہا، انوری نے درخواست کی، کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کر دے، انوری نے فرمائش کی تعمیل کی،

بر سمرقند اگر بگذری اے باد سحر
نامۂ اہل خراساں بہ بر خاقان بر

نامۂ مطلع او، رنج تن و آفت جاں
نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر

نامۂ بر رقمش، آہ شہیداں پیدا
نامۂ در شکنش، خون شہیداں مضمر

تاکنوں حالِ خراسان و رعایا بودہ است | بر خداوے خاقان پوشیدہ مگر
اے کیومرث بقا، بادشہ کسریٰ عدل | اے منوچہر لقا، خسرو افریدون فر
قصۂ اہلِ خراسان بشنو از سرِ لطف | چوں شنیدی، ز سرِ رحم دریشاں بنگر
ایں دلِ افگار جگر سوختگاں می گویند | کائے دل و دولت و دیں از تو شادی و ظفر
خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں | نیست یک تن ز خراسان کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار | بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر
شاد الا بدرِ مرگ نہ بینی مردم | بکر جز در شکم مادر نیابی دختر
بر مسلماناں ز آں شکل کنند استخفاف | کہ مسلماں نہ کند صد یک آں با کافر
خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد | ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک سیر
رحم کن رحم بر آں قوم کہ جویند جویں | از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر
رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد | از پس آنکہ از اطلس شاں بودے بستر

کسی دوست کو دعوت میں بلایا ہے، اور نظم میں رقعہ لکھا ہے،

ندارد مجلسِ ما بے تو نورے | اگرچہ نیست مجلس درخورِ تو
چہ فرمائی چہ گوئی مصلحت چیست | تو آئی نزد ما؟ یا ما برِ تو

دربارداری اور دریوزہ گری سے توبہ کی تو یہ قطعہ لکھا،

من و ایں عہد کہ با قحبۂ رعنای جہاں | بعد ازاں عشق بنازم نہ بسہو و نہ بہ عمد
قوت دادن اگر نیست مرا باکے نیست | قوت ناستدن ہست فللہ الحمد

یعنی اگر دوسروں کو دینے کا مقدور نہیں تو یہ قدرت تو ہے کہ دوسروں سے کچھ نہ لوں،

علم کی بے قدری پر اس طرح غصہ ظاہر کرتا ہے،

اے خواجہ مکن، تا بتوانی طلب علم | تا در طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز | تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی
فرعون و عذابِ ابد و ریشِ مرصع | موسیٰ کلیم اللہ و چوبی و شبانی

یعنی فرعون کافر ہو کر داڑھی میں موتی پروتا تھا، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہو کر بکریاں چراتے تھے،

عوام کی بے تمیزی کو ایک فرضی قصہ میں ادا کرتا ہے،

روبہے می دوید در غم جان | روبہے دیگرش بدید چناں
گفت خیر است؟ باز گوئی خبر | گفت خر گیری مے کند سلطان
گفت تو خر نۂ چہ می ترسی | گفت آرے و لیک آدمیان
می ندانند و فرق می نہ کنند | خرد رو باہِ شاں بود یکساں

شیخ سعدیؒ نے "ایں ہم بچۂ شتر است" کا لطیفہ غالباً یہیں سے لیا ہے،

بات چیت، خط کتابت میں ایشیائی تکلفات سے انوری بھی تنگ آگیا تھا، چنانچہ کہتا ہے اور کس بے تکلفی سے کہتا ہے،

تکلّف میانِ دو آزاد مرد | بود ناپسندیدہ و سخت کام
بیا تا تکلّف بیک سو نہیم | نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام
بہ سنت کنم اقتدا زیں سپس | سلامٌ علیکم، علیکم سلام

**ہجو** | انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اُس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک، اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں، ان ہجوؤں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے، صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا جو کلام زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سینکڑوں اشعار ہیں لیکن دو ایک کے سوا، ایک بھی درج کرنے کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدۂ آذر موجود ہے، ہم اپنے دست و قلم کو اس لئے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے،

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلہ کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی دیکھو کس لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

سہ بیت رسم بود شاعراں طامع را | یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا | ازیں سہ بیت دو گفتم، وگرچہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اوّل مدح، پھر قطعہ تقاضائی جس میں صلہ کا تقاضا ہوتا ہے، اب ممدوح نے صلہ دیا تو شکریہ ورنہ ہجو، ان تین نظموں سے میں دو تو کہہ چکا، فرمایئے اب کیا ارشاد ہوتا ہے،

گھوڑے کی ہجو لکھتا ہے،

بر عادت از وثاق بصحرا بروں شدم | با یک دو آشنا ہم از ابنائے روزگار
اسپے چناں کہ دانی زیراز میانہ زیر | وز کاہلی کہ بود نہ سکسک نہ راہوار
در خفت و خیز ماند ہمہ راہ عیدگاہ | من گاہ از و پیادہ وگاہے بر او سوار
نہ از غبار خاستہ بیروں شدے بزور | نہ از زمین خستہ برانگیختے غبار
گہ طعنۂ از یں کہ رکابش دراز کن | گہ بذلۂ از اں کہ عنانش فرو گذار
من والہ و خجل متحیر فرو شدہ | چشمے سوئے پیمنم و گوشے سوئے سوار

سوداؔ نے گھوڑے کی ہجو میں جو قصیدہ لکھا ہے، اسی کا تتبع ہے، چنانچہ بحر و قافیہ بھی یہی ہے۔

نکتہ - انوریؔ کے دیوان میں چند ہجویں، انوریؔ کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں، عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوریؔ کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا، لیکن غالباً اور شعرا نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دیں، اور چونکہ پبلک اُس کی دشمن تھی، اس لئے وہ اسی طرح قائم رہ گئیں، اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ فتوحیؔ مروزی انوریؔ کے نام سے بلخ کی جو ہجو لکھ کر مشہور کر دی، وہ آج تک انوریؔ کے دیوان میں داخل ہے، حالانکہ ابوالحسن فراہانی شارح قصائد انوری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ وہ ہجو فتوحیؔ مروزی کی تصنیف ہے،

انوریؔ علوم عربیہ میں کمال رکھتا تھا، اس لئے اس کے کلام میں یہ خصوصیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے کہ عربی تلمیحات، عربی جملے، عربی الفاظ اس خوبی سے شامل کرتا ہے، کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے، ملاحظہ ہو،

شاعری، دانی، کدامی قوم کردند آنکہ بود | اوّل شان امرؤ القیس آخر شان بو فراش
دین کہ من خادم ہمی پروازم اکنوں سالہاست | سامری گو تا بیاید گو شمال لامساس

سنائیؔ کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے، اسمیں اکثر قافیے اسی قسم کے آئے ہیں، مثلاً

بردجان بدرتن در شیشئہ دہ کہ دیر افتد | زجاجوج تمنا رخنہ در سدِّ دلو شیئنا
بلے انجا ھدوا یکسر بدست تست این رشتہ | دیک از جاھدوا ہم بر بخیز و بیچ بے قلقنا
چوں مراد خویش را با ملک رے کردم قیاس | در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس
چوں غنیمت را مقابل کردہ شد ہا امیتی | عقل سی روز و طمع ماہے بود ا ساکو اس
انظروا فانقبتس من نورکم گفت چرخ | کافتاب از آفتاب ہمتت کرد اقتباس

ہمدہ افیئنا یعنی

تا کہ باشد این مثل کالیاس احدی الراحتین | بادے اندر راحتے کو را نباشد ہیم یاس
بے سپیدہ دم شب خذلان بدخواہت چنانکہ | تا بصبح حشر میگوید احادٌ ام سداس

متنبی کے اس مطلع کی طرف اشارہ ہے، احادٌ ام سداسٌ فی احاد،

دوستاں بایک پُرخوں کہ اینک قد مضیٰ | دشمناں بایکدگر پُرخندہ کاینک قد ہلک

---

آدم از نسبت وجود تو یافت | اختصاصِ خلقتہ بیدی
دوش با آسماں ہمے گفتم | بر سبیل سوال مطلب ای
کای علی اخرج این حشم برکیست | ہمتت گفت قد ضنیت علی
میر آب ست وحق ہمی گوید | کہ من الماء کل شیئٍ حیٌّ

---

خصم تو و قاعدۂ ملک او | آں شدہ از بدو جہاں مستقیم
چوں دو بنا بود برافراشتہ | زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم
زلزلۂ قہر تو شاں کرد پست | زلزلۃ الساعۃ شی عظیم

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں اُس کی مضمون آفرینیوں سے استدلال کرتے ہیں،

متنبی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے، لیکن انسانوں سے فائق ہے جس طرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے، لیکن خون سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہے،

فان تفق الانام وانت منھم | فان المسک بعض دم الغزال

اس سے ترقی کر کے شراب و انگور کی مثال دی ہے،

فان فی الخمر معنی لیس فی العنب

یعنی گو شراب انگور سے بنتی ہے، لیکن یہ انگور سے بڑھ کر ہے، ممدوح کا بھی یہی حال ہے، انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا،

در جہانی واز جہاں بیشی | ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے، لیکن دنیا سے زیادہ ہے، جس طرح عبارت میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذرا سی ہوتی ہے اور مضمون نہایت وسیع ہوتا ہے،

زحرص خدمت او سرنگوں ہمے آیند | بوقت زادن از ارحام مادراں طفلاں

بچے عموماً ماں کے پیٹ سے سر کے بل پیدا ہوتے ہیں، انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا ہے

کہ انسان فطرۃً ممدوح کی خدمت کے خواہشمند ہیں، اس لئے دُنیا میں آتے ہیں، تو سر کے بل آتے ہیں، مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صفت ہے، انوری اس میدان میں سب سے آگے ہے،

ممدوح کی مدح میں
ع اے بیش ز آفرینش و کم ز آفریدگار
ع چیست کاں بر تو روانیست مگر عزّ و جل

بزرگوارا کاندر کمال قدرت خویش — نہ ایزد ست و چو ایزد، بزرگ بے ہمتا ست
گر صبا از کف و دست تو ز و دوقت بہار — درم افشاں و مد از شاخ بروں دست چنار

**انوری اور یورپ** انوری کی خوش قسمتی میں ایک نمبر یہ بھی اضافہ کرنا چاہیئے کہ یورپ نے اس کے کلام کے ساتھ نہایت اعتنا کیا، رُوس کے پروفیسر والن ٹن ژوکوسکی نے ۱۸۸۳ء میں بمقام سینٹ پیٹرسبرگ، انوری کے کلام اور اس کی سوانح عمری پر ایک کتاب لکھی جس کا نام یہ ہے، "میٹریس فار اے بیوگرفی اینڈ کیرکٹرسٹک اسکیچ" یہ کتاب ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

| | |
|---|---|
| دیباچہ | از صفحہ ۱ تا ۷ |
| مقدمہ | ۸ تا ۲۴ |
| باب اوّل | ۱ تا ۳۰ اس میں انوری کی سوانح عمری ہے |
| باب دوم | ۳۱ تا ۷۸ مشتمل بر خصوصیات انوری |
| باب سوم | از ۷۹ تا ۹۷ مشتمل بر شروح کلام انوری |
| باب چہارم | از ۹۸ تا ۱۰۲ انوری کی زبان اور تاریخ تصانیف۔ |
| باب پنجم | از ۱۰۳ تا ۱۳۵ ترجمہ قصائد انوری |
| باب ششم | از ۱۳۵ تا ۱۳۷ ترجمہ غزلیات انوری |

پروفیسر براؤن نے اس کتاب کا حال تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین اس کو ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اہل یورپ ہر زبان کے متعلق کیا کیا نکتہ سنجیاں اور دیدہ ریزیاں کرتے ہیں کہ ہم ان کی تقلید بھی نہیں کر سکتے،

# نظامی

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلّص، باپ کا نام مؤیّد تھا، وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے، لیکن دراصل قم کے رہنے والے تھے، چنانچہ خود سکندرنامہ میں فرماتے ہیں،

چو دُر گرچہ در بحرِ گنجہ گمم | ولے از قہستانِ شہرِ قمم

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے، اصل وطن یہاں تھا، لیکن چونکہ قم صدر مقام ہے اس لئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں، نظامی کے والد بزرگوار وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے، نظامی یہیں پیدا ہوئے، سالِ ولادت کسی نے بیان نہیں کیا، لیکن چونکہ بروایت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے، اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کی جاتی ہے، اس لئے سالِ ولادت ۵۳۳ھ سمجھنا چاہیئے،

نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا، ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں، ان کا ایک قصیدہ ہے، جس میں تمام صنائع شاعری جمع کر دیئے ہیں،

نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی، ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ علمی مسائل ان کے پیشِ نظر ہیں، خود بھی دعویٰ کرتے ہیں،

ہر چہ ہست از دقیقہائے نجوم | بایکایک نہفتہائے علوم
خواندم و سرِّ ہر ورق جستم | چوں ترا یافتم ورق شستم

سلسلۂ طریقت میں داخی فرج زنجانی سے بیعت تھی،

نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے، گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا، اس لئے درسی علوم سے فارغ ہو کر تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا، تو حرف موزون نکلے، مشق روز بروز بڑھتی گئی، اور کلام کا شہرہ دُور دُور پہنچا، یہاں تک اُس زمانہ کے

---

ؔ یہ امین رازی اور لطف علی آذر کی تحقیق ہے، لیکن سکندرنامہ کے جس شعر سے امین رازی نے استدلال کیا ہے، وہ موجودہ نسخوں میں مذکور نہیں، تفرش کی مزید تفصیل، اور نظامی کی جائے ولادت لطف علی آذر سے ماخوذ ہے؛

تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمائش کر کے اُن سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں، اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا، لیکن یہ سعادت دُور والوں کی قسمت میں لکھی تھی، سب سے پہلے جس یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام[1] شاہ تھا، نظامی نے مخزن الاسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی، اور صلہ میں اُسنے پانچہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر، اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے،

مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا،

نظامی کا وطن گنجہ، سلجوقیوں کی حدودِ حکومت میں واقع تھا، اور اُس زمانہ میں اس سلسلہ میں سلطان طغرل بن ارسلان فرماں روا تھا، وہ نہایت دلیر، شجاع اور عدل پرور بادشاہ تھا، علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا، چنانچہ یہ رباعی اسکی مشہور ہے،

دی روز چناں وصال جاں افروزی | وامروز چناں فراق عالم سوزی
حیف است کہ در دفتر عمرم ایام | آں را روزے نویسد، ایں را روزی[2]

طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اتابک محمد بن ایلدگز کے ہاتھ میں دے دیا تھا، جو ابتدا میں غلام تھا اور ترقی کرتے کرتے امیر الامراء کے منصب پر پہنچ گیا تھا، محمد ابن ایلدگز کا بھائی قزل ارسلان جس کی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور ہے،

نہ کرسی فلک نہد، اندیشہ زیر پائے | تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

کاروبارِ سلطنت میں برابر کا شریک تھا،

اُس زمانہ میں نظامی نے شیریں خسرو کہنی شروع کی تھی، کتاب کا ابھی آغاز تھا، کہ اس کے چرچے دُور دُور پھیل گئے، طغرل کو خبر ہوئی، اسی وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھیئے کہ یادگار رہ جائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں،

---

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے منکوچک غازی کو جو قائم بامر اللہ کا منظور نظر تھا، ازرنجان اور کماخ وغیرہ کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا، اس کے خاندان میں سے بہرام شاہ نے بہت جاہ و جلال حاصل کیا، یہانتک سلطان قلیج ارسلان سلجوقی بادشاہ روم نے اس کو اپنی لڑکی بیاہ دی، بہرام شاہ نہایت فیاض اور بلند ہمت تھا، یہی بہرام، نظامی کا ممدوح ہے، جس کے نام پر اُنہوں نے مخزن الاسرار لکھی،

(از ہفت اقلیم امین رازی)

[2] حبیب السیر،

چو سلطان جہاں شاہ جواں بخت | کہ برخوردار باد از تاج واز تخت
بہ سلطانی بہ تاج و تخت پیوست | بجای از ارسلاں بر تخت بنشست
من این گنجینہ رادم می کشادم | بنای این عمارت مے نہادم
اشارت رنجے از درگاہ معمور | بہ شغل بندہ القا کرد منشور
کز نیساں تحفۂ عالی بسازد | کہ عقل از منش گردن فرازد

جس زمانہ میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے، ان کے ایک دوست جو مذہب میں نہایت تعصب رکھتے تھے، ان کے پاس آئے اور نہایت ناراضی کے لہجہ میں کہا کہ کافروں کے جھوٹے سچ قصے لکھنے سے کیا فائدہ،

فسوں بت پرستاں بفگن از مشت | فسوں خوانی مکن بر ژند زردشت
در توحید زن کا وازہ داری | چرا رسم مغاں را تازہ داری

لیکن نظامی نے جب مثنوی کے چند اشعار پڑھ کر سنائے، تو انہوں نے بیساختہ کہا،

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن | بتے با کعبۂ انبار کردن

شیریں خسرو جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلدکز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا، وفات کرچکا تھا، اور اس کا بھائی قزل ارسلاں اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا اس کو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا، قاصد فرمان لے کر آیا، نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا، پھر تین جگہ بوسہ دے کر کھولا، چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں،

مثال شاہ را بر سر نہادم | سہ جا بوسیدم و سر بر کشادم

اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے، اور دشت و بیابان طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے، قاصد نے جاکر دربار میں اطلاع کی، قزل ارسلاں نے شمس الدین محمد کو حکم دیا کہ خود جاکر اُن کو ساتھ لائے، دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ مجلسِ عیش آراستہ ہے، ساز چھڑ رہے ہیں، گانا ہو رہا ہے، بادہ و جام کا دَور چل رہا ہے، قزل ارسلاں نے فوراً ان کے ادب سے گانا بجانا بند کرا دیا، اور تخت سے اُٹھ کر تعظیم بجالایا، پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہر طرح کی باتیں ہوتی رہیں، بیچ بیچ میں بزرگانہ نصیحتیں کرتے جاتے تھے، مدحیہ نظم لکھ کرلے گئے تھے، اس کو سنانا چاہا قاعدہ یہ تھا کہ شعرا اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے، بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے، جو ہمیشہ

اُن کے ساتھ رہتا تھا، اور اُس کو راوی کہتے تھے، چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا، یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہو جاتا تھا، اور قصیدہ کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا، نظامی نے بھی اس قاعدہ کو بجالانا چاہا، لیکن قزل ارسلان نے قسم دلاکر منع کیا،

چو بر پا ایستادم گفت بنشیں　　　به سوگندم نشاند این منزلت بیں

راوی نے مدح کے بعد، شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا، بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سُن رہا تھا اور بار بار بیساختہ تحسین کرتا جاتا تھا، نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا، اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے، پھر پوچھا کہ بھائی صاحب (اتابک پہلوان محمد بن ایلد کز) نے آپ کی جاگیر میں جو دو گاؤں دیئے تھے، وہ آپ کو ملے یا نہیں، اُنہوں نے کہا،

بلے شاہ سعید از خاص خویشم　　　پذیرفت آنچه فرمودی زبیشم

چو رخت عمر او کشتی رواں کرد　　　مرانے جملہ عالم رازیاں کرد

قزل ارسلان نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں تھا، اپنی طرف سے جاگیر میں دیا[1]، معلوم نہیں، جان کر یا غلطی سے، گاؤں جو جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد اور بنجر تھا، چنانچہ نظامی شیریں خسرو میں، اس کی شکایت اس تقریب سے کی ہے، کہ حاسدوں نے مجھ کو طعنہ دیا، میں نے جواب میں کہا کہ غیر آباد ہے تو کیا، بادشاہ عدل اس کو آباد کر دیگا،

نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہو گئی تھی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ اُن سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں، کہ اس ذریعہ سے اُن کا نام بھی یادگار رہ جائے، ان میں علم و فضل کی قدردانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ آخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کے سلسلہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی النسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا، خاقانی ابو العلاء گنجوی (اُستاد خاقانی) ذو الفقار شروانی، شاہفور وغیرہ شعراء اسی کے خوانِ کرم کے زلہ خوار تھے، ابو العلاء گنجوی، اسی کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور خاقانی کو افضل الشعراء کا خطاب اسی نے عنایت کیا، منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجئے، چنانچہ دیباچہ میں خود کہتے ہیں،

---

[1] یہ تمام حالات تفصیل کے ساتھ خود نظامی نے شیریں خسرو کے خاتمہ میں لکھے ہیں،

در حال رسید، قاصد از راہ — آورد مثال حضرت شاہ
بنبشتہ بہ خط خوب خویشم — دہ پانزدہ سطر نغز بیشم
کاے محرم حلقۂ غلامی — جادو سخن جہان نظامی
خواہم کہ بہ یاد عشق مجنوں — گوئی سخنے چو دُرِّ مکنوں

خط پہنچا تو نظامی کو تردد ہؤا، اتفاق سے اُن کے صاحبزادے محمد جن کی عمر اسوقت چودہ[۱۴] برس کی تھی، اس وقت موجود تھے، اُنھوں نے بھی تحریک کی، نظامی نے کہا جانِ پدر قصہ کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن جہاں کی سرگذشت ہے، وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں، باغ و بہار، چشمہ و سبزہ زار، رقص و سرود، شاہی درو دربار، خیل و حشم، جاہ و جلال کسی چیز کا پتہ نہیں خشک ریگ زار، اور کوہستان میں میں کیا صنعت کاری دکھاؤں گا،

نے باغ و نہ بزم شہریاری — نے رود و نہ مے نہ کامگاری
بر خشکیٔ ریگ و سختیٔ کوہ — تا چند سخن رود در اندوہ

یہی بھید ہے کہ آجتک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا، صاحبزادہ نے کہا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا مؤثر اور عجیب و غریب واقعہ نظم کی آرائش سے محروم رہ جائے، غرض نظامی نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی، اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی، سالِ اتمام رجب سنہ ۵۸۴ھ ہے،

من گفتم و دل جواب می داد — خاریدم و چشمہ آب می داد
ایں چار ہزار بیت و اکثر — گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغل دگر حرام بودے — در چاردہ شب تمام بودے
تاریخ عیاں کہ داشت باخود — ہشتاد و چہار بود و پانصد

نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے ولیعہدِ سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں،

۱۴ رمضان سنہ ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ[۱] ارسلان علاء الدین آقسنقری کی فرمائش سے ہفت پیکر لکھی، جس میں بہرام گور کا قصہ ہے،

قزل ارسلان کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجہ یعنی محمد بن ایلدگز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃ الدین

---

۱؎ اس کا حال معلوم نہ ہو سکا،

۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا، نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا، اسوقت تک اُنہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، سلاطینِ وقت کی فرمائش سے لکھی تھیں، لیکن سکندر نامہ اپنی خواہش سے لکھا، اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب ۵۹۹ھ میں انجام کو پہنچی، چنانچہ خود سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

به پایاں شد این داستاں دری — به فیروز فالی و نیک اختری
ز ہجرت چناں برد ہم یادگار — نود نہ گزشتہ ز پانصد شمار

کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، تو مقررہ رقم کے علاوہ، سواری کا گھوڑا، بیش قیمت کپڑے، خلعت وغیرہ عطا ہوا،[۱]

اساتذہ سے میں نے سُنا کہ سلاطینِ وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے، کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی، اُن کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے، کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو، نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا، چنانچہ کہتے ہیں،

دو گوہر بر آمد ز دریائے من — فروزندہ از روی شاں رائے من
یکے عصمتِ مریمے یافتہ — یکے نورِ عیسےٰ بروتافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ — کہ یاقوت را درج دارد نگاہ
عروسے کہ دو را وز مادر بود — بہ ار پردہ دارش برادر بود
بباید چو آید بر شہریار — چنیں پردگی را چناں پردہ دار
چو من نزل خاص تو جا دادہ ام — جگر نیز با جاں فرستادہ ام

اخیر شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے،

اس کتاب کی تصنیف کے وقت اُن کی عمر ۶۳ برس کی تھی، چنانچہ جہاں اور حکمار کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہے، اپنے نام کی بھی سُرخی قائم کی ہے، اس کے ذیل میں لکھتے ہیں،

نظامی چو ایں داستاں شد تمام — بہ عزم شدن تیز برداشت گام
فزوں بود شش مہ ز شصت و سہ سال — کہ بر عزم رہ بر دہل زود وال

---

[۱] سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں یہ تصریح ہے، لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے، اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لیے جائیں تب بھی ایسی رقم ہے جو نہ نظامی شایان ہے، نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہے۔

اس کتاب پر ان کی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا، سالِ وفات میں سخت اختلاف ہے دولت شاہ میں ۵۹۶ھ لکھا ہے، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہے، تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے، جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں، لیکن اس قدر قطعی ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہے اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے، چونکہ اُنہوں نے تمام عمر گوشۂ عزلت سے قدم نہیں نکالا، نہ لوگوں سے زیادہ ملتے جلتے تھے، اِس لئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہیں، عام تذکرہ نویس، اِن کے اس وصف کے نہایت مداح ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خوشامد اور درباداری سے بالکل پاک تھے، البتہ جو سلاطین ان کے ساتھ ارادت و اعتقاد کے ساتھ پیش آتے تھے، ان پر بزرگانہ عنایت کرتے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں سلاطین کی جو مدحیں ہیں، ان میں وہی حد سے زیادہ مبالغہ، خوشامد اور تملق ہے جو عام مداحوں کا اندازہ ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کے سوا کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اس کو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں، بے شُبہہ اُنہوں نے مدحیہ قصایٔد نہیں لکھے، لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو،

ولایت ستاں شاہِ گیتی پناہ — فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ
ستارہ کہ بر چرخ ساید سرش — زدہ سکۂ عبدہٗ بر درش
چو تیر از کمان کمین افگند — سرِ آسماں بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطین و رہبان روم — پذیرائے فرمان مہرش چو موم

اِس سے زیادہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہی ہوتی ہے جو گداپیشہ شاعروں کا انداز ہے، یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے سارے کام بن جائیں گے، حضور ہی میری مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں،

**کلام** پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں، موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے، تذکروں میں چند قصائد، قطعات اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں، لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں، ملاحظہ ہو:

خوشا جانے کزو جانے بیاسود — نہ درویشے کہ سلطانے بیاسود

نکوئی بر نکو روئے بماناد — کہ از لبہاش دندانے بیاسود
بہ عمر خود پریشانی مبنیاد — دلے کز وے پریشانے بیاسود

مرا گوئی کہ چونی؟ چونم اے دوست — جگر پُر درد دل پُر خونم اے دوست
شنیدم عاشقاں را مے نوازی — مگر من زاں میاں بیرونم اے دوست

پیش تو کردہ ام عیاں حال تباہ خویش را — تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہِ خویش را
سر زنشم مکن کہ تو شیفتہ تر ز من شوی — گر نگری در آئینہ روئے چو ماہ خویش را

ختنی جمالی اے ماہ ز حبش چہ نام داری — تو بجز خطے و خالے ز حبش کدام داری
حبشی منم بہ در تن ہمہ سوختست خونم — ختنی توئی کہ در بر ہمہ سیم خام داری
حبشی است رنگ مویت ختنی است رنگ رویت — تو میان این دو کشور بہ کجا مقام داری
حبشی سفید نہ بود ختنی نمک نہ دارد — تو بغایتِ سفیدی نمکے تمام داری

انہی بُوڑھے غمزوں ہیں، کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں،

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی — گر صواب است بگو ورنہ خطائے بہ کنم
میں لب کا ایک بوسہ چاہتا ہوں کہئے کیا رائے ہے — مناسب ہو تو بہتر، ورنہ نامناسب ہی کیا جائے

قصیدے بہت ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، سنائی کا انداز ہے، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں، اس لئے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہایت صاف، شُستہ اور پُر لُطف کہا ہے، جس کا آہنگ جواب نہ ہو سکا،

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود — می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار — یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم، در نکشود
پاسے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رُخ بنمود
گفت خیر است! دریں وقت کرا میخواہی — بے محل آمدنت بر درِ ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوی — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشانید — کہ تو دیر آئی و اندر و صف پیش استی زود
این خرابات مغان ست درو رندانند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر — مومن و برہمن و گبر و نصاریٰ و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی — خاک پائے ہمہ شو، تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے، لیکن جواب نہ ہو سکا، عصمت کا قطعہ یہ ہے،

سرخوش از کوی خرابات گذر کردم دوش | بہ طلب گاری ترسا بچۂ بادہ فروش
پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے | کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش
گفتم ایں کوی چہ کوی است ترا خانہ کجاست | اے مۂ نو خم ابروی ترا حلقہ بگوش
گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند | سنگ بر شیشۂ تقویٰ زن و پیمانہ بنوش
بعد ازاں پیش من آ تا بتو گویم سخنے | راہ بنمایم اگر بر سخنم داری گوش
دیں برافگندہ و مدہوش دویدم در پیش | تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دیں ماند و نہ ہوش
دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست | از خم بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش
بے می و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرود | بے می و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش
چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم | خواستم تا سخنے پرسم ازو گفت خموش
ایں نہ کعبہ است کہ بے پا و سر آئی بہ طواف | ویں نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش
ایں خرابات مغان است درو رندانند | از دم صبح ازل تا بقیامت مدہوش

قصیدہ میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا، اور جس قدر مثنویاں لکھیں، سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں، تاہم قصیدہ کو انہوں نے مداحی سے آزاد رکھا۔ اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنف سے اور بھی مفید کام لئے جا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقش قدم پہ کوئی نہ چلا قصیدے اس وقت سے آج تک خوشامد کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں،

## نظامی کی شاعری

نظامی نے شاعری کو جس طرح ترقی دی اور جو باتیں اس میں پیدا کیں ان کو ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ان سب کو اجمالاً لکھ دینا چاہئے تاکہ یکجائی طور سے سب باتیں پیش نظر ہو جائیں، ان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) جامعیت، یعنی شاعری کی ہر صنف کو انہوں نے ترقی دی،

(۲) زورِ کلام، (۳) بلاغت، (۴) جدّتِ استعارات اور تشبیہات،
(۵) ایجاد و اختراع اور قوتِ تخیّل،
(۶) اوّلیات یعنی بہت سی باتیں اوّل انہی نے ایجاد کیں،
اب ہم ایک ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

**جامعیت** ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں وہ خاص خاص انواعِ شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی رزم کا مردِ میدان ہے، عشقیہ شاعری میں ان کو کمال نہیں، سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں، لیکن رزم پھیکے ہیں، چنانچہ سکندر نامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت بوستان میں لکھی ہے، اگرچہ اس میں اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے، لیکن وہ بوڑھاپن نہیں جاتا، ایک مصرع نہایت زور شور کا ہے، دوسرے میں دفعتاً پست ہو جاتے ہیں، خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے، حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے نظامی نے رزم، بزم فلسفہ، عشق، اخلاق، سب کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی، لیکن مدح کوئی شاعری نہیں، شاعر بھاٹ نہ ہو تو اس کی شاعری میں کیا نقص ہے، نظامی کی انواعِ شاعری پر الگ الگ بحث آگے آتی ہے،

**اولیات،** نظامی بہت سی باتوں کے موجد ہیں،

مثلاً سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں، جس کی تقلید اُس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعراء کرتے آئے ہیں، چنانچہ اُن کے خمسہ پر تمام اکابر شعراء نے خمسہ لکھا ہے،

مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اوّل انہی نے مثنوی میں داخل کیا،

سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں اور ہر ایک کا جُدا رنگ ہے،

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا،

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا،

سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا،

**زورِ کلام** نظامی سے پہلے شعراء کا کلام، صفائی، سادگی، شستگی تک محدود رہا تھا، اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری کے کمال کا اندازہ کیا جاتا تھا، نظامی پہلے شخص ہیں، جس نے ترکیبوں میں چستی اور کلام میں زور، بلندی اور شان و شوکت پیدا کی، عُرفی اور ابو الفضل کی نظم و نثر کا زور مشہور ہے، مگر دونوں پر نظامی ہی کا اثر ہے، یہاں تک کہ طغرا نے کہہ دیا کہ ابو الفضل نے سکندر نامہ

ہی کو لے کر نثر کر دیا ہے،

فردوسی کے زمانہ تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا، عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہو جاتی تھیں، یہاں تک کہ علوم عربیّت کے گھر گھر پھیل جانے سے روزمرّہ کی زبان بھی وہی مخلوط العربیتہ فارسی ہو گئی، اب عربی الفاظ کا جُدا کرنا، فارسی زبان کا بدمزہ اور بے اثر کر دینا تھا، اس لئے نظامی نے اس باب میں فردوسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ اسی زبان کو لیا جو ملک اور قوم کی عام زبان تھی، لیکن ان کی نکتہ سنجی یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے جو لفظ ان کے ہاں آتے ہیں وہ ہوتے ہیں کہ ہم اس کا ہم معنی کوئی لفظ اس انداز اور شان و شوکت کا تمام زبان میں نہیں مل سکتا، یہی بات ہے کہ ان کے کسی مضمون کو جب کوئی شاعر اپنے لفظوں میں ادا کرنا چاہتا ہے، تو وہ شان قائم نہیں رہتی، مثلاً اُن کا یہ شعر کمند کی تعریف میں ہے،

کمند اژدہائے مسلسل شکنج  دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

سعدی اسی مضمون کو یوں تصرف کرتے ہیں،

بہ صید ہژبراں پرخاش ساز  کمند اژدہائے دہن کردہ باز

دونوں کے مضمون اور معنی میں جو فرق ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن الفاظ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرو، کس قدر فرق ہے، مسلسل شکنج، تاراج، گنج، یہ الفاظ، اور ان کی پُرزور ترکیب، سعدی کے ہاں کہاں ہے،

فردوسی، سعدی اور نظامی کے ہاں جو مضامین مشترک ہیں، اُن کا باہم موازنہ کرو، بلاغت سے قطع نظر، الفاظ کی شکوہ و شان اور ترکیبوں کی چُستی اور نظم و نسق میں نظامی کا کلام علانیہ ممتاز نظر آئے گا، نمونہ کے لئے ہم صرف دو ایک مثالیں درج کرتے ہیں،

فردوسی خدا کی ذات اور عالم غیر عنصری کے ادراک کی حد سے خارج ہونے اس طرح ادا کرتا ہے،

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ  کہ او برتر از نام واز جایگاہ
سخن ہرچہ زیں گوہراں بگذرد  نیابد بدو راہ جان و خرد
ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست  بہ ہستیش اندیشہ را راہ نیست

نظامی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں

اساسے کہ در آسمان و زمی است  بہ اندازۂ فکرت آدمی است

شود فکرت اندازہ راہنموں — سر از حدِ اندازہ نارد بروں
بہر پایۂ دست چنداں رسد — کہ آں پایہ را حد بہ پایاں رسد
چو پایاں پذیرد حد کائنات — نماند در اندیشہ دیگر جہات
نیندیشد اندیشہ افزوں ازیں — کہ ہستی نہٗ، بلکہ بیروں ازیں

اسی مضمون کے قریب قریب یہ اشعار ہیں،

چناں برکشیدی و بستی نگار — کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار
چناں بستی ایں طاقِ نیلو فری — کہ اندیشہ رانیست زو برتری
چناں آفریدی زمین و زماں — ہماں گردش انجم و آسماں
کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند — سرِ خود بروں نادروزیں کمند

شاید تم کو خیال ہو کہ فردوسی کے بہت سے الفاظ، اب نامانوس ہیں، نظامی ان کے بجائے متداول الفاظ لاتے ہیں، اس کے سوا نظامی کو یہ موقع حاصل ہے کہ جہاں فارسی الفاظ سے شان و شکوہ نہ پیدا ہو سکے وہاں عربی الفاظ سے کام لیں، فردوسی اپنے التزام کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، نظامی جہاں خود فردوسی کی بولی بولتے ہیں، وہاں بھی یہ فرق قائم رہتا ہے، عناصر کی ابتدا اور ان کی ترکیب کو دونوں نے لکھا ہے اور خالص سادہ فارسی میں لکھا ہے، **فردوسی**:-

از آغاز باید کہ دانی درست — سرِ مایۂ گوہراں از نخست
یکے آتشے برشدہ تابنک — میاں باد و آب از بر تیرہ خاک
نخستین کہ آتش ز جنبش دمید — دگر میش بس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود — ز سردی ہماں باز تری فزود
چو ایں چار گوہر بجائے آمدند — ز بہر سپنجی سرائے آمدند
گہر ہا یک اندر دگر ساختہ — ز ہر گونہ گردن برافراختہ

یعنی عناصر (گوہر) کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے آگ بلندی پر پیدا ہوئی، اس کے پیچھے ہوا، پھر پانی، پھر خاک، آگ حرکت سے پیدا ہوئی، اس کی حرارت کی وجہ سے یبوست پیدا ہوئی، پھر سکون کی وجہ سے برودت کا وجود ہوا، برودت نے رطوبت پیدا کی، یہ عناصر باہم ترکیب پا کر عالم بنا،

**نظامی** زگشت سپہر آتش آمد پدید — کہ آتش بہ نیروی گرمش دمید

زنیروے آتش ہوائے کشاد | کہ مانند او گرم دارد نہاد
بہ بادے گرایندہ شد گوہرش | کہ گردندگی دور بود از برش
چکید از ہوا قطرۂ در مغاک | پدید آمد آبے چناں نغز و پاک
چو ہر چار گوہر بہ امر خدائے | گرفتند بر مرکز خویش جائے
مزاج ہمہ در ہم آمیختند | و زور سینہا برانگیختند

ان اشعار میں امر، مرکز مزاج کے سوا باقی تمام الفاظ فارسی ہیں، لیکن فردوسی کے الفاظ اور ترکیب الفاظ میں وہ بلندی اور شان نہیں جو نظامی کے ہاں ہے، گشت سپہر، نیرو، نہاد، گرانیدہ، گردندگی، مغاک، نغز، ان الفاظ اور ان کی حسن ترکیب نے جو بات پیدا کی مذاقِ صحیح اس کا اندازہ کرسکتا ہے،

اسی مضمون کو ایک اور جگہ لکھا ہے،

نخستیں طلسمے کہ پرداختند | زمیں بود و ترکیب از و ساختند
چو نیروی جنبش درو کرد کار | با فسردگی زود آمد بخار
از و ہر چہ رخشندہ و پاک بود | سزاوار اجرام افلاک بود
دگر بخشہا کاں بلندی نداشت | بہر مرکزے مایۂ می گذاشت
یکے بخش از و آتش روشن است | کہ بالاتر طاقِ ایں گلشن است
دگر بخش از و باد جنبیدہ خواست | کہ تا او نہ جنبد نداند کو است
سوم بخش از و آب راوق پذیر | کہ ہستش ز راوق گری ناگریز

ان اشعار میں اکثر فلسفیانہ اصطلاحات کو عربی کے بجائے فارسی میں ادا کیا ہے، مثلاً.

| عربی | فارسی | عربی | فارسی |
|---|---|---|---|
| قوتِ حرکۃ | نیروی جنبش | قسر | افسردگی |
| نوع | بخش | مادہ | مایہ |
| متحرک بالطبع | جنبندہ خو | سیال | راوق پذیر |

نظامی کے اشعار کا سعدی سے مقابلہ کرو، تو یہ فرق اور واضح ہو جاتا ہے، مثلاً نظامی انقلابات

زمانہ اور واقعاتِ عالم کی عبرت انگیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

فلک بر بلندی، زمیں بر مغاک — یکے طشت خوں شد یکے طشت خاک
نوشتہ برین ہر دو آلودہ طشت — ز خونِ سیاوش بسے سرنوشت

سعدی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار مردی آہستہ تر — کہ چشم و بنا گوش و روی است و سر
جوانی شد و زندگانی نماند — جہاں گو ممان چوں جوانی نماند

عہد شباب کی حسرت کو دونوں نے لکھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

چو باد خزانی در افتد بہ باغ — زمانہ دہد جائے بلبل بہ زاغ
بود برگ ریزاں چو شاخِ بلند — دلِ باغباں زاں شود دردمند
بنال اے کہن بلبل سال خورد — کہ رخسارۂ سرخ گلگشت زرد
دوتا شد سہی سروِ آراستہ — کدیور شد از باغ برخاستہ
فرو ماند دستم ز مے خواستن — گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت — گلم سرخی انداخت زردی گرفت
ہیون روندہ زدہ ماند باز — ببالیں گہ آمد سرم را نیاز

سعدی لکھتے ہیں،

چو باد صبا بر گلستان وزد — چمیدن درختِ جواں را سزد
نہ زیبد مرا با جواناں چمید — کہ بر عارضم صبحِ پیری دمید
شمارست نوبت برین خواں نشست — کہ ما از تنعم بشستیم دست
گلِ سرخ رویم نگر زرناب — فرو رفت چوں زرد شد آفتاب
گلستانِ ما را طراوت گذشت — کہ گلدستہ بندد چو پژمردہ گشت

**قوت تخییل** شاعری کے تمام نازک اور مشکل مقامات ہیں ان کی جدّت اور اختراع کی عجیب وغریب صناعیاں نظر آتی ہیں، قصّہ کے خاکے کھینچے ہیں، ترتیبِ واقعات ہیں، تمہید ہیں، واقعہ نگاری ہیں، بندش مضامین ہیں، تشبیہات ہیں، استعارات ہیں، مبالغے ہیں ہر جگہ نیا انداز نظر آتا ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ تخییل دامنیجیش، کس قدر قوی اور زبردست ہے۔

بادشاہ کی مدح لکھتے ہیں، اور یہ تمہید اٹھاتے ہیں،

علم برکش اے آفتابِ بلند ... خراماں شو، اے ابرِ مشکیں پرند
بنال اے دلِ رعد چوں کوسِ شاہ ... بخند اے لبِ برق چوں صبحگاہ
ببار اے ہوا، قطرۂ ناب را ... بگیر اے صدف در کن آں آب را
برآ اے دُر از قعرِ دریائے خویش ... بہ تاجِ سرِ شاہ کن جائے خویش

قدیم خیال یہ تھا کہ آفتاب کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں، اس سے بادل پیدا ہوتے ہیں، بادل برستا ہے، تو سیپ کے منہ میں جو قطرے پڑتے ہیں، موتی بن جاتے ہیں، ان خیالات کی بناپر نظامی کہتے ہیں،

او آفتاب، علم اٹھا، او سیہ پوش بادل، آہستہ آہستہ چل، اور رعد انقارۂ شاہی کی طرح کڑک، او بجلی، صبح کی طرح ہنس، او ہوا قطرے برسا، او سیپ قطرہ کو لے کر موتی بنا، او موتی دریا کی تہ سے نکل، اور نکل کر بادشاہ کے تاج پر جگہ لے،

بات اتنی تھی کہ بادشاہ کا تاج جواہر نگار ہے، لیکن شاعر کو قوتِ تخیل کے ذریعہ سے یہی بات اِس صورت میں نظر آتی ہے کہ عالم کا تمام کاروبار صرف بادشاہ کی اوج شان بڑھانے کیلئے ہے، اس کی قوتِ خیالیہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، ممدوح کے بل پر اس کو تمام عالم اپنا محکوم نظر آتا ہے، اور وہ تحکمانہ انداز سے آفتاب، بادل، رعد، برق اور ہوا کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے کام انجام دے کر موتی تیار کرو، تاکہ بادشاہ کے تاج پر ٹانکے جائیں، اس کے ساتھ اندازِ بیان کے زور، الفاظ کی شوکت، بندش کی ذردبست کو دیکھو کہ طلسم کا عالم نظر آتا ہے، پھر خیال کرو کہ ایک ایک مختلف حالت کو کس طرح صرف ایک ایک مصرع میں کھپا دیا ہے

مثال ۲۔ سکندر نامہ میں متعدد جگہ آفتاب کے غروب، اور طلوع کو بیان واقعہ کی حیثیت سے لکھا ہے، لیکن ہر جگہ ایک نیا پیرایہ قائم کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں،

چو یاقوتِ خورشید را دزد بُرد ... بہ یاقوت جستن جہاں پے فشرد
بہ دزدی گرفتند مہتاب را ... کہ ایں برد آں گوہرِ ناب را

یعنی جب آفتاب کا یاقوت چوری گیا تو زمانہ نے یاقوت کے ڈھونڈھنے کیلئے دوڑ دھوپ شروع کی، آخر چاند کو جاکر پکڑا کہ اُس نے یہ جوہر چُرایا ہے، چونکہ آفتاب کے غروب کے بعد چاند نکلتا ہے، اس لئے اس کو چور قرار دیا،

که چوں آتش روز روشن گذشت | پر از دُود شد گنبد تیز گشت
شب از ماہ بربست پیرایۂ | شگفتے بود نور در سایۂ

یعنی جب دن کی آگ بجھ گئی تو دُھواں اُٹھا (یعنی رات) اور گنبد (آسمان) میں بھر گیا، رات نے چاند کا زیور پہنا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ سایہ میں نور نظر آتا ہے،

دگر روز کیں ساقیٔ صُبح خیز | زمی کرد بر خاک، یاقوت ریز
چو خورشید برزد سر از گنج نیل | فرو شست (یعنی دھوپ) گردوں قبار از نیل
چو در برقع کوہ رفت آفتاب | سر روز روشن، فرو شد بخواب
شب تیرہ چوں اژدہائے سیاہ | زماہی برآورد سر سوئے ماہ
سیہ کرد بر شیرواں راہ را | فرد برد چوں اژدہا ماہ را
سپاہِ سحر چوں علم بر کشید | جہاں، حرف شب را قلم در کشید
چو سلطانِ شب، چتر بر سر گرفت | سواد جہاں راہ عنبر گرفت
ستارہ چناں گنجے از زر فشاند | کہ مہد زمیں گاؤ بر گنج راند
کہ چوں شاہ چیں صبح را بار داد | عروس عدن دُرّ بہ دینار داد (رات، شاہ چیں، آفتاب)
چو شب در سر آورد کحلے پرند | سر مہ در آمد بہ مشکیں کمند

**استعارات اور تشبیہات** | نظامی کی خصوصیاتِ شاعری میں نہایت نمایاں خصوصیت استعارات اور تشبیہات کی جدّت ہے، استعارہ اور تشبیہہ اگر صرف حسنِ کلام اور تفننِ طبع کے کام آئے تو وُہ کوئی بڑی چیز نہیں، لیکن بعض استعارے یا تشبیہات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اصل مضمون پر پڑتا ہے، یعنی مضمون کا زور بڑھ جاتا ہے، جو بات صفحوں میں ادا ہو سکتی ہے، ایک لفظ سے ادا ہو جاتی ہے، صُورتِ واقعہ کی تصویر اس طرح سامنے آجاتی ہے، کہ کسی اور طرح سے نہیں آسکتی تھی، اِس قسم کے استعارات اور تشبیہیں اور شعرا کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، لیکن نظامی کا کلام ان سے بھرا پڑا ہے، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا ہے، اِس موقع پر اس واقعہ کو یُوں ادا کرتے ہیں۔

نسب نامۂ دولتِ کیقباد | ورق بر ورق ہر سُوئے بُرد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا اخیر فرماں روا تھا، اور اس کے مرنے سے گویا، اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہہ نے کس قدر مُوثر اور بلند کر دیا، دارا کو خاندان کیانی کا

نسب نامہ کہا، یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج ہوتے ہیں، دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے، اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس سب کی مجموعی عظمت وشوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہے، پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا کہ نسب نامۂ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا، اسی مضمون کو ایک اور تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیا ہے،

بہار فریدوں و گلزار جم ۔۔۔ ز بادِ خزاں گشت تاراجِ غم

سکندر نے جب دارا کی سسکتی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد ۔۔۔ شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد

سکندر نے جب دارا کو گستاخانہ جواب لکھا ہے، تو دارا کہتا ہے،

ازاں ابر عاصی چناں ریزم آب ۔۔۔ کہ نارد دگر دست بر آفتاب

اس سرکش بادل کو اس طرح نچوڑ دونگا ۔۔۔ کہ پھر آفتاب پر ہاتھ نہ بڑھا سکے

سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہے تو حملہ کی تیزی اور زور کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بہ کبک دری چوں در آید عقاب ۔۔۔ چگونہ جہد بر زمیں آفتاب

ازاں تیز تر خسروِ پیلتن ۔۔۔ بہ تندی در آمد بہ آں اہرمن

آفتاب سورج کو بھی کہتے ہیں، اور دھوپ کو بھی، اس موقع پر بلاغت کے انداز کو دیکھو تشبیہ سے ابتدا نہیں کی، بلکہ مخاطب سے کہتے ہیں، کہ تم کو خیال ہے کہ عقاب چکور پر کیونکر گرتا ہے، دھوپ کس طرح زمین پر دفعۃً چھا جاتی ہے؟ اس سے مقصد یہ ہے کہ پہلے کے ذہن میں اچھی طرح یہ سماں قائم ہو جائے، پھر کہتے ہیں " اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر اس دیو پر حملہ کیا"، حملہ کی خاص حالت سے قطع نظر کرکے سکندر کو آفتاب اور حریف کو زمین سے تشبیہ دینا، یوں بھی موزوں تھا، تشبیہ مرکب نے اس لطف کو اور دوبالا کر دیا،

سکندر نے جب ایک روسی پہلوان پر کمند پھینکی ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار ۔۔۔ بینداخت چوں چنبر روزگار

کہنا یہ تھا کہ سکندر نے اس طرح کمند پھینکی کہ حریف کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتا تھا، اس مضمون کو چنبر روزگار کی تشبیہ نے کس قدر پرزور کر دیا،

رسول اللہ صلعم نے جب خسرو پرویز کو خط لکھا ہے تو خط میں عرب کی رسم کے مطابق اپنا

نام خسرو کے نام سے پہلے لکھا تھا، خسرو نے خط کھولا تو چونکہ ایران میں بادشاہ کا نام عموماً تمام تحریروں میں پیشانی پر لکھا جاتا تھا، رسول اللہ صلعم کا نام سرنامہ پر دیکھ کر خسرو سخت جھلا اٹھا، اور خط کو پرزے پرزے کر کے پھینک دیا، اس موقع کو نظامی نے شیریں خسرو میں جہاں لکھا ہے خسرو کی جھلاہٹ اور برہمی کو اس طرح تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں،

چوں عنواں گاہ عالم تاب را دید　　تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

دیوانہ کتا جب کسی کو کاٹ کھاتا ہے، تو سگ گزیدہ پانی کو دیکھ کر بڑے زور سے جھجھکتا ہے، اب تشبیہ کے تمام اجزا پر خیال کرو، رسول اللہ صلعم کا خط آب شیریں ہے، خسرو نے چونکہ رسول اللہ صلعم کے خط سے بے ادبی کی ہے، اس لئے شاعر اس کو سگ نجس سمجھتا ہے، فوری اور شدت کی جھلاہٹ، سگ گزیدہ کی اس مخصوص حالت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی، اِن سب باتوں کو پیشِ نظر رکھو، تو نظر آئیگا، کہ یہ مضمون جس طرح اس تشبیہ سے ادا ہوسکتا تھا، اور کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا تھا،

قدماء اور متاخرین کی خصوصیات جدا جدا ہیں اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ گو قدماء کی متانت، پختگی، جزالت کے مقابلہ میں متاخریں کا کلام سبک معلوم ہوتا ہے، تاہم متاخرین کی بعض بعض خصوصیتیں اس قابل ہیں کہ اُن پر رشک کیا جائے، ان میں ایک تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت ہے، قدماء آس پاس کی چیزوں سے سادہ سادہ تشبیہیں پیدا کرتے تھے، استعارے بھی سادے اور سہل الماخذ ہوتے تھے، لیکن متاخرین کے زمانہ میں تمدن بہت ترقی کر گیا تھا، اِس لئے انسانی احساسات نازک اور لطیف ہوگئے تھے، اس بنا پر اب قدماء کی تشبیہیں بے مزہ ہوگئی تھیں، اس کو مادیات کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ جب کسی قوم کا تمدن، ابتدائی حالت میں ہوتا ہے تو وہ نہایت تیز اور کرخت خوشبو کو پسند کرتی ہے، اور کم درجہ کی خوشبو کو اس کا دماغ اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ عرب مشک اور عنبر، اور ہندو تلسی اور ناز بو کی خوشبو پسند کرتے تھے، لیکن آج چونکہ ہر چیز میں لطافت پیدا ہوگئی ہے، مشک اور تلسی کی خوشبو سے بعض وقت دماغ پراگندہ ہوجاتا ہے، اب گلاب اور کیوڑہ کا عطر درکار ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انگریزی عطر محبوب ہے، جو اس قدر لطیف ہوتا ہے، کہ عام آدمیوں کو اس کی خوشبو محسوس بھی نہیں ہوتی، استعارہ اور تشبیہ کا بھی یہی حال ہے، استعارہ اور تشبیہ کی یہ لطافت، متاخرین کا خاصہ ہے، مثلاً قدماء معشوق کے چہرہ کو آفتاب سے اور اس کی ہنسی کو خندۂ صبح سے تشبیہ دیتے

تھے، لیکن متأخرین کے مذاق میں ایک شاعر کہتا ہے، ع

صبح ز خورشید رخت خندہ

یعنی معشوق کا چہرہ ہنسا تو صبح ہو گئی، یعنی صبح خود معشوق کی ہنسی کا نام ہے،
استعارہ اور تشبیہ کی اس لطافت اور نزاکت کے موجد نظامی ہیں، انہوں نے اس کثرت سے نازک اور لطیف استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں، کہ متأخرین میں سے بھی کسی ایک شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

به باغ شعله درو دهقان انگشت — بنفشه می درود و لاله می کشت

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ بھڑکتی جاتی تھی، اس کو اس طرح ادا کیا کہ انگیٹھی کا دہقان، شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا، اور لالہ بوتا جاتا تھا،

درآمد نقشبند مانوی دست — زمیں را نقشہ ہائے بوسہ می بست

کہنا یہ تھا کہ مصوّر جب دربار میں آیا، تو آداب دربار کے موافق زمین بوس کرتا آتا تھا، اس کو اس طرح پر ادا کیا کہ مصوّر بوسوں سے نقش و نگار کرتا آتا تھا،

به نوشیں لب آں جام را نوش کرد — ز لب جام را حلقہ در گوش کرد

پیالہ پینے کے وقت لب کی جو ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کو حلقہ سے تشبیہ دی ہے، اور اس بنا پر پیالہ کو لب کا حلقہ بگوش قرار دیا ہے،

ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ — زمرد را بہ مروارید بستہ

شبنم کو موتی سے، اور سبزہ کو زمرد سے تشبیہ دی ہے، اس بنا پر کہتا ہے کہ ہوا نے سبزہ پر جو موتی بکھیر دیئے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمرد میں موتی ٹانک دیئے ہیں،

ز گیسو گہ کمرے کرد و گہ تاج — بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

معشوقہ جو زلفوں کا کبھی جوڑا باندھتی تھی اور کبھی کمر پہ چھوڑ دیتی تھی، اس کو تاج و کمر سے تشبیہ دی ہے،

قلم کی تعریف، ع مشک در جیب لعل در داماں،
عاشق و معشوق کا ہمکنار ہونا،

شبا روزے دگر خفتند مدہوش — بنفشہ در سمن نسرین در آغوش

نوشابہ کا جواب دینا،

بہ پاسخ نمودن زنِ ہوشمند — زیاقوت سربستہ بکشاد بند

ازاں سیمگوں سکۂ نوبہار — درم ریزکن بر لبِ جوئبار

آغازِ بہار میں جو شگوفے کھلتے ہیں، اِن کو بہار کا سکہ قرار دیا ہے،

زبار یدن ابر کافور بار — سمن رستہ از دستہائے چنار

یعنی چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھلے ہیں،

سمنبر غافل از نظارۂ شاہ — کہ سنبل بستہ بد برنرگسش راہ

یہ اُس وقت کا بیان ہے کہ شیریں نہا رہی تھی، اور زلفوں کو چہرہ پر چھوڑ دیا تھا، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شیریں کو خسرو کے نظارہ کی خبر نہ تھی، کیونکہ سُنبل نے نرگس کا راستہ روک رکھا تھا،

گشادہ طاقِ ابرو تا سر دوش — کشیدہ طوقِ غبغب تا بنا گوش

خوابِ نرگس، خمار دیدۂ او — نازِ نسرین، درم خریدۂ او

چو برفرق آب مے انداخت از دست — فلک بر ماہ مرواریدمی بست

سمن ساقی و نرگس جام بردست — بنفشہ در خمار و سُرخ گل مست

بنفشہ تاب زلف افگندہ بردوش — گشادہ باد نسریں را بنا گوش

گونہ گونہ گلے شگفتہ درد — سبزہ بیدار آب خفتہ درد

بعض اوقات تشبیہ سے ہیبت اور عظمت مقصود ہوتی ہے، اس قسم کی تشبیہات آج تک کسی نے نظامی سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی نہیں پیدا کیں، مثلاً

کمند اژدہائے مسلسل شکنج — دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

زمیں کو بساطے بد آراستہ — غبارے شد، از جائے برخاستہ

دراں دجلۂ خوں بلند آفتاب — چو نیلوفر، افگند زورق در آب

ز شمشیر برگشتہ جائے نبود — کہ در غارِ وے اژدہائے نبود

زخم کو غار اور تلوار کو اژدہا سے تشبیہ دی ہے،

اے مدنی برقع و مکی نقاب — سایہ نشیں چند بود آفتاب

تاج تو و تخت تو دارد جہاں — تخت زمیں آمد و تاج آسماں

زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک — چو گو گرد سُرخ آتشیں گشت خاک

نہنگ خدنگ، از کمین کماں　　　　نیاسود بر یک زمیں یک زماں

شاعری کی لطافت اور رنگینی کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ بے جان چیزوں کو صاحبِ ادراک قرار دے کر اُن کی نسبت ارادی کام منسوب کیے جائیں، مثلاً عرفی کہتا ہے،

نہ گفت و من بشنودم، ہر انچہ گفتن داشت　　　　کہ در بیاں نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت　　　　فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

یعنی اُس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سُن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں، اس کی نگاہوں نے زبان سے پیشدستی کی، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا، یا مثلاً

راضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز　　　　از زباں انچہ دمِ عرض تمنا ماند

متاخرین نے اِس طرز کو نہایت وسعت دی، اور اس سے نہایت لطیف اور رنگین نئے نئے اسلوب پیدا کئے، لیکن اس طرز کے موجد نظامی ہیں، شیریں خسرو میں لکھتے ہیں،

نہاں با شاہ می گفت آں بنا گوش　　　　کہ مولائے توام، با حلقہ در گوش

چو سر پیچید گیسو مجلس آراست　　　　چو رُخ گردید گو دن عذر ہا خواست

بگویم غمزہ را تا وقت شب گیر　　　　سمندش را برقص آرد بیک تیر

بگویم زلف را تا یک فن آرد　　　　شکیبش را رسن در گردن آرد

نظامی کے یہ مضامین، متاخرین کے شمع راہ ہے، جس کی روشنی میں ان کو گوناگوں اسالیب کا سلسلہ ہات آگیا، نظامی نے جب (پہلے شعر میں)، بنا گوش کی نسبت یہ باندھا، کہ اُسی نے چپکے سے بادشاہ سے کہا، تو بے تکلف ایک شاعر اس کو یوں بدل کر کہہ سکتا ہے،

ع　زلف او خم شدہ در گوش سخن می گوید

شعر کے سینکڑوں انواع ہیں، لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں، رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی، جذبات انسانی کا اظہار اور مناظر کی تصویر، ان میں سے ہر نوع کو نظامی نے لیا ہے اور معراجِ ترقی تک پہنچا دیا ہے، سکندر نامہ میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ سکندر کے حالات تین حیثیتیں رکھتے ہیں، سلطنت نبوت، فلسفہ و حکمت، میں تینوں قسم کے حالات لکھوں گا، اور تفصیل سے لکھوں گا،

گروہیش خوانند صاحب سریر　　　　ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر

گروہے ز دیوان دستور او　　　　بہ حکمت نوشتند منشورِ او

گروہے ز پاکی و دیں پروری　　　　پذیرا شدندش بہ پیغمبری

من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند
درختے برومند خواہم نشاند

چنانچہ سکندر نامہ بری میں کشورستانی اور سکندر نامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں،

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصر خسرو کے سوا، کسی نے ادا نہیں کئے، لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں، اس بنا پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بوعلی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دئے ہیں کہ زبان کی کم مائگی کی شکایت نہیں ہو سکتی، اور اگر متاخرین بھی اس کے نقش قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ہوتی۔

سکندر نامۂ بحری میں انہوں نے ایک خاص داستان سکندر اور حکمائے یونان کی فلسفیانہ بحثوں کے متعلق لکھی ہے، اس میں ارسطو، افلاطون، والیس، بلیناس، سقراط، فرفوریوس، دیار فیریس، ہرمس کے اقوال اور رائیں لکھی ہیں، ہندوستان کے ایک حکیم نے سکندر سے سوالات کئے تھے، سکندر کی زبان سے اُن کے جوابات لکھے ہیں، ان تمام بحثوں میں فلسفہ کی اصطلاحیں فارسی میں ادا کی ہیں، عربی الفاظ جا بجا آتے ہیں، لیکن اس حد تک کہ زبان نامانوس اور دساتیر و ژند نہ بن جائے،

ایک ہندو حکیم نے سکندر سے سوال کیا تھا کہ نظر بد کیا چیز ہے؟ اس میں کہاں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے؟ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز کو پسند کیا جائے تو اس کی ترقی کا سبب ہوتا ہے، بخلاف اس کے بدنظر جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی کو نظر لگتی ہے، سکندر نے جواب دیا کہ انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو آنکھ سے شعاعیں نکل کر اس چیز پر پڑتی ہیں، شعاع ہوا سے گزر کر اس چیز تک پہنچتی ہے، اب ہوا میں اگر سمیت ہے تو یہ شعاعیں بھی اس سے آلودہ ہو کر زہریلی ہو جاتی ہیں اور اس چیز کو جاکر نقصان پہنچاتی ہیں ——

اس سے قطع نظر کر کے کہ سوال و جواب دونوں طفلانہ ہیں، یہ دیکھو کہ نظامی ان باتوں کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

دگر بار ہندو درآمد بہ گفت
گہر کرد باز ک الماس جفت

کہ بر چشم بد شاہ دہ مرا
زچشم بد آگاہ دہ مرا

چہ نیرو ست، در جنبش چشم بد
کہ نیکوئی خود را کند چشم زد

ہمہ چیز را کاز نمائش رسید
چو دیدہ پسندد فزائش رسید

جز اُو راکہ ہر چہ پسند آورد　　سر و گردنش زیر بند آورد
بہر حرفتے چونکہ دیدیم ژرف　　درستی ندیدیم در ہیچ حرف
ہمیں یک کماندار شد از نخست　　بر آماج گہ تیر او شد درست
ع　بگو تا چہ نیروست نیروے او
جہاندار گفتا کہ طالع شناس　　چنیں آرد از روی معنی قیاس
کہ بر ہر چہ گردد نظر جائے گیر　　گزر بر ہوائے کند ناگزیر
بر آں چیز کارد نظر تاختن　　کند با ہوائے دم ساختن
بنہ چوں در آرد بہ آں رخت گاہ　　ہوا نیز یابد بر آں رخنہ راہ
ہوا گر ہوائے بود سودمند　　در ارکان آں چیز ناید گزند
مزاج ہوا گر بود زہرناک　　بینداز د آں چیز را در مغاک
ہوائے بد ست آنکہ در چشم زد　　بدارد بہ ہمراہئے چشم بد

موجودات کی ابتدا، اور اُن کی ترتیب، افلاک، عناصر، سلسلۂ علل، ان تمام بحثوں کے متعلق، یونانی حکماء کی رائیں نقل کی ہیں، اور ان تمام مباحث میں بہت کم عربی کے الفاظ کو دخل دیا ہے،

**اخلاقی شاعری**

نظامی کی شاعری کا بڑا حصّہ اخلاق کے متعلق ہے، مخزن الاسرار کے سوا جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہے، اور مثنویوں میں بھی جا بجا اخلاقی ہدائتیں موقع بموقع لکھی ہیں، چنانچہ کسی صاحبِ ذوق نے خاص اس قسم کے اشعار کو اُن کے پنج گنج سے چُن کر یکجا جمع کر دیا ہے اور اخلاق کے ۳۵ عنوان قرار دے کر ایک ایک عنوان کے نیچے تمام مثنویوں کے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، جو اس عنوان سے تعلق رکھتے تھے، میں نے اس مجموعہ کا ایک نہایت خوشخط نُسخہ، عالمگیری کتب خانے کا حیدر آباد میں دیکھا تھا،

**جذباتِ انسانی**

شاعری کی اس اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا، قدماء میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اور انصاف یہ ہے کہ فردوسی بھی اس خصوصیّت میں اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا، فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہے معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہے، بخلاف اس کے نظامی نہایت نازک، لطیف اور دقیق پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، مثلاً دارا جب زخمی ہو کر گرا ہے تو سکندر اس کے پاس گیا ہے، اور دارا نے اس سے حسرت ناک باتیں کی ہیں، فردوسی نے اس موقع پر وہی معمولی افسوس اور عبرت کے کلمات ادا کر دیئے ہیں، جو

ہر شخص کے خیال میں آسکتے ہیں، لیکن نظامی کی نظران نازک اور دقیق نکتوں تک پہنچی ہے، جہاں ہر شخص کا وہم رسائی نہیں پاسکتا، دارا کوئی معمولی آدمی نہ تھا، بلکہ دُنیا کے وسیع خطّہ کا شاہ اور شاہنشاہ تھا، شکست کھانے اور خود اپنے نوکروں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرنے کا اس کو صدمہ ہے اور اس وجہ سے افسوس، حسرت اور بیکسی کے خیالات اس کے دل میں ہجوم کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی شاہنشاہ ادعا، غرور اور تمکنت کا نشہ بھی سر میں ہے، اِس لئے اس کے غمزدہ اور عاجزانہ الفاظ بھی صولت اور رُعب کے لہجہ میں ادا ہوتے ہیں، اس کی آہیں بھی نعرۂ جنگ ہیں، اس کی پُرحسرت نگاہیں بھی برقِ غضب ہیں، نظامی ان تمام خصوصیات کو دکھاتے ہیں،

چو در موکبِ قلبِ دارا رسید ز موکب رواں ہیچ کس را ندید
تنِ مرزباں دید در خاک و خوں کلاہِ کیانی شدہ سرنگوں
بہ بازوئے بہمن بر آسودہ مار ز روئیں دژ افتاد اسفندیار
بہارِ فریدوں و گلزارِ جم ز بادِ خزاں گشتہ تاراجِ غم
نسب نامۂ دولتِ کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بُردہ باد
سکندر فرود آمد از پشتِ بور درآمد بہ بالینِ آں پیل زور
بہ بالیں گہِ خستہ آمد فراز ز درعِ کیانی گرہ کرد باز
سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد
چو دارا بر ویش نگہ کرد و دید بہ سوزِ جگر آہ از دل کشید
چنیں داد دارا بہ خسرو جواب کہ بگذار تا سر نہم من بہ خواب
رہا کُن کہ در من رہائی نماند چراغِ مرا روشنائی نماند
سپہرم بداں گونہ پہلو درید کہ شُد در جگر پہلوم ناپدید
رہا کُن کہ خواب خوشم مے بُرد زمیں آب و چرخ آتشم مے برد
سرِ سروراں را رہا کن ز دست تو مشکن کہ ما را جہاں خود شکست
چو من زیں ولایت گشادم کمر تو خواہ افسر از من ستاں خواہ سر
اگر تاج خواہی ربود از سرم یکے لحظہ بگذار تا بگذرم
ببیں سرور را در سرافگندگی چناں شاہ را در چنیں بندگی
دریں بندم از زحمت آزاد کُن بہ آمرزش ایزدی یاد کُن

چو گشت آفتاب مرا روی زرد — نقابے بمن در کش از لاجورد
مگرداں سر خفتہ را از سریر — کہ گردون گرداں برآرد نفیر
تو اے پہلواں کامدی سوئے من — نگہدار پہلو ز پہلوئے من
کہ با آں کہ پہلو دریدم چو میغ — ہمے آید از پہلوم بوئے تیغ
چہ دستے کہ با مادر ازی کنی — بہ تاراجِ کیاں دستبازی کنی
نگہدار دستت کہ داراست ایں — نہ پنہاں چو روز آشکاراست ایں
زمیں را منم تاج تارک نشیں — مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

اِس واقعہ کو فردوسی نے بھی لکھا ہے، لیکن زور اور اثر نہیں، چنانچہ اس موقع کے اشعار ہم درج کرتے ہیں،

بر آنم کہ از پاک دادار خویش — بیابی تو پاداشِ گفتارِ خویش
یکے آنکہ گفتی کہ ایراں تراست — سرِ تاج و تختِ دلیران تراست
بمن مرگ نزدیک تر زانکہ تخت — بپرداخت تخت از نگوں گشتہ بخت
بریں است فرجام چرخِ بلند — خرامش ہمہ رنج و سردش گزند
بمردی نگر تا نگوئی کہ من — فزونم ازیں نامدار انجمن
بد و نیک، ہر دو ز یزداں شناس — وزو دار تا زندہ باشی سپاس
نمودار گفتار من، من بسم — بریں داستاں عبرتِ ہر کسم
کہ چنداں بزرگی و شاہی و گنج — مرا بود از من بند کس برنج
ہماں نیز چنداں سلیح و سپاہ — گراں مایہ اسپاں و تخت و کلاہ
ہماں نیز فرزند و پیوستگاں — چہ پیوستگاں داغِ دلخستگاں
زمین و زماں بندہ بد پیشِ من — چنیں بود تا تخت بدخویشِ من
چو از من ہماں بخت بیگانہ شد — ہمہ کاخ و ایوان چو ویرانہ شد
ز نیکی جدا ماندہ ام زیں نشاں — گرفتار در دست مردم کشاں
ز فرزند و خویشاں شدہ نا اُمید — سیہ شُد جہاں، دیدگانم سفید
ز خویشاں کسے نیست فریاد رس — امیدم بپروردگار است و بس
بدیں گونہ خستہ بخاک اندرم — ز گیتی بدام ہلاک اندرم

بریں است، آئین چرخ رواں     اگر شہریاری اگر پہلواں

بزرگی بفر جام ہم بگذرد     شکار است و مرگش ہمی بشکرد

سکندر ز دیدہ ببارید خوں     براں شاہِ خستہ بخاک اندروں

چو دارا بدید از دل درد ادی     بر اشکِ رواں بر رُخِ زرد ادی

بدو گفت مگری کز و سود نیست     ز آتش مرا بہرہ جز دود نیست

**مناظرِ قدرت** | مناظر قدرت کو جابجا لکھا ہے اور جہاں لکھا ہے، نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے مناظرِ قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے، جس پر تمام شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں، اور دادِ سخن دی ہے، لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں، تمام شعرا نے صرف بہار کا سماں دکھانے پر اکتفا کیا ہے، لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ سا چھا جاتا ہے، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہے، گلدستے بنا کر درختوں پر اُچھالتا ہے، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہے اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہے، حوض کے پاس چنبیلی کے پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہے، بغل میں معشوق ہے، اُس کی زلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہے، اور دُنیا سے آزاد ہو جاتا ہے، مُرغانِ چمن سے فرمائش کرتا ہے کہ ہاں پھر اسی انداز سے اُڑنا ساتھ ہی ساز بھی چھیڑتا جاتا ہے، اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہے

بیا باغباں خرمی ساز کن     گل آمد در باغ را باز کن،

نظامی بباغ آمد از شہر بند     بیارای بستاں بہ چینی پرند،

ز جعدِ بنفشہ بر انگیز تاب     سرِ نرگسِ مست برکش ز خواب

ز سیمائے سبزہ فرو شوی گرد     کہ روشن بہ شستن شود لاجورد

درختاں شگفتند در طرفِ باغ     برافروختہ ہر گلے چوں چراغ

بہ مرغ زباں بستہ آوازہ دہ     کہ پروازِ پارینہ را ساز دہ

سرایندہ کن نالۂ چنگ را     برآور بہ رقص ایں دلِ تنگ را

سرِ زلفِ معشوق را طوق ساز     برافگن ز گردن خود ایں طوقِ ناز

ریاحین سیراب را دستہ بند     برافشاں بہ بالائے سروِ بلند

ازاں سیمگوں سکۂ نوبہار     درم ریز کن بر لبِ جوئبار

بہ پیرامنِ برکۂ آب گیر     ز سوسن در افگن بساطِ حریر

---

[1] یہ نکتہ بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ نظامی نے ان باتوں کو بجائے خبر کے انشاء کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور یہ زیادہ بلیغ ہے،

**عشقیہ** ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ عشق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعری نے ادا کئے، دنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کر سکتی، اس قسم کی شاعری کے لئے غزل مخصوص کر دی گئی ہے اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں، نام کے لئے غزل کی بنیاد ان سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ قدماء کے بوڑھے غمزے ہیں،

بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں، لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے، عشقیہ مثنویاں نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جن میں سے فردوسی کی یوسف زلیخا آج بھی موجود ہے، لیکن مثنویاں وہی قدماء کی غزلیں ہیں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بنیاد ڈالی اور اس کو ترقی دی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) عشق و عاشقی کے خیالات کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے جس کے الفاظ نازک، لطیف اور شیریں ہوں، خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں، ادائیں دلآویزی اور دلفریبی ہو، یہ زبان خاص نظامی نے پیدا کی ہے، قدماء کی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی مثنویوں سے مقابلہ کرو تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے،

غزل کے مہمات مضامین یہ ہیں، معشوق کے حسن کی تعریف، ادا اور ناز و غمزہ کے کرشمے، الگ الگ اعضا کا بیان اور ان کی تشبیہات، عاشق و معشوق کے معاملات یعنی راز و نیاز، اصرار و انکار، سوال و جواب، عجز و غرور، وغیرہ، ان تمام مضامین کو نظامی نے اس وسعت، تنوع، رنگینی اور لطافت سے ادا کیا ہے کہ ان کا ہر ہر شعر سینکڑوں غزلوں کا سرمایہ ہے، چند مثالیں ذیل میں درج ہیں،

شیریں کا غسل کرنا،

| | |
|---|---|
| چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نور | فلک را آب در چشم آمد از دور |
| پرند آسماں گوں بر میاں زد | بشد در آب و آتش در جہاں زد |
| تن صافش کہ می غلطید در آب | چو غلطد قاقمے بر روی سنجاب |
| چو بر فرق آب می انداخت از دست | فلک بر ماہ، مروارید می بست |
| زہر سو شاخ گیسو، شانہ می کرد | بنفشہ بر سر گل، دانہ می کرد |
| در آب انداختہ از گیسواں شست | نہ ماہی بلکہ ماہ آوردہ در دست |

شیریں آراستہ ہو کر خسرو کے سامنے آتی ہے،

پس آنکہ ماہ را پیرایہ بربست ۔۔۔ نقاب آفتاب از سایہ بربست
فرو پوشید گلنارے پرندے ۔۔۔ برو ہر شاخِ گیسو چوں کمندے
سمن را غوشے برآمودہ بگوہر ۔۔۔ بہ ریسم چینیاں افگندہ بر سر
(دوپٹہ) بدیں طاؤس کردارے ہمائے ۔۔۔ رواں شد چوں تذروے در ہوائے

ایک موقع پر جب خسرو نے شیریں سے زیادہ اختلاط کرنا چاہا ہے، تو وہ برہم ہو کر اٹھی ہے اس حالت میں اس کا تن کر کھڑا ہونا، پیشانی کا غصّہ سے سمٹنا، چہرہ کا کھل جانا، بدن ڈھکنے میں حسن کا اور چمکنا، بالوں کو کبھی چھوڑ دینا، ان تمام اداؤں کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

بگفت ایں وچو سرو از جای برخاست ۔۔۔ جبیں را گرد کرد و فرق را راست
یہ کہہ کر سرو کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔ پیشانی سمٹ گئی اور قد تن گیا
بہ آں آئین کہ خوباں را بود دست ۔۔۔ زنخداں می کشاد و زلف می بست
اس خاص انداز سے جس میں معشوقوں کو کمال ہوتا ہے ۔۔۔ چہرہ کھولنے اور بال سمیٹنے لگی،
جمالِ خویش را در خز و خارا ۔۔۔ بہ پوشیدن ہمے کرد آشکارا
اپنے حسن کو حریر اور کمخواب میں جس قدر ۔۔۔ چھپاتی تھی، اسی قدر اور کھلتا تھا،
گہے بر فرق تند آشفتہ می بود ۔۔۔ گرہ می بست و بر مہ مشک می سود
کبھی زلفوں پر جھلاتی تھی اس میں ۔۔۔ گھونگھر بناتی تھی اور چاند پر مشک ملتی تھی
بہ زیور راست کردن دیر می شد ۔۔۔ کہ پائش بر سرِ شمشیر می شد،
زیور کے سنبھالنے میں دیر ہوئی جاتی تھی ۔۔۔ کیونکہ جلدی کی وجہ سے گویا اس کا قدم تلوار پر تھا
زگیسو گہ کمر می کرد گہ تاج ۔۔۔ بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج
زلفوں کو کبھی کمر سے لپیٹتی تھی اور کبھی سر پر جوڑا باندھتی تھی ۔۔۔ جو کمربند اور تاج بنجاتی تھی اور اس کمربند اور تاج کا خسرو بھی محتاج تھا

ایک موقع پر شیریں جب روٹھ کر اٹھی تو اس ادا سے اٹھی جس میں لگاوٹ بھی پائی جاتی تھی، اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

بہ چشمے ناز بے اندازہ می کرد ۔۔۔ بہ دیگر چشم عذرے تازہ می کرد
چو سر پیچید، گیسو مجلس آراست ۔۔۔ چو رخ گردید، گردن عذرہا خواست
نمود اندر ہزیمت شاہ را پشت ۔۔۔ بہ گو گرد سفید آتش ہمی کشت
غلط گفتم نمودش تختۂ عاج ۔۔۔ کہ شاہ را نیز باید تخت یا تاج

حسابے دیگر آں بود ش درا ں کوی — کہ پشتم نیز محراب است چوں روے
دگر د جہ آنکہ گرد چہ شد از دست — از آں روشن ترم د جہے دگر ہست
چہ خوش تا زیست نازے خو برویاں — ز دیدہ راندہ را ز دیدہ جویاں
بہ چشمے خیرگی کردن کہ برخیز — بہ دیگر چشم دل دادن کہ مگریز

مُنہ پھیر کر بھاگنے کی توجیہیں کس قدر شاعرانہ ہیں، یعنی اس کو یہ دکھانا تھا کہ جس طرح میرا چہرہ، محرابی اور روشن ہے، اسی طرح پیٹھ بھی محرابی اور بلّوری ہے،

غزلیہ شاعری کا ایک بڑا میدان معشوق کا ناز و غرور ہے، نظامی نے داستاں کی داستان اس مضمون پر لکھی ہے، جس کا ہر شعر غزل کا کام دے سکتا ہے،

خسرو نے جب شیریں کو شاہی اقتدار کا زور دکھانا چاہا ہے، تو وہ کہتی ہے،

ہنوزت در سر از شاہی غرور است — دریغا کیں غرور از عشق دور است
ابھی تک تیرے سر میں سلطنت کا غرور ہے — لیکن افسوس عشق کو غرور سے کیا نسبت

دریں گرمی آہِ سرد باید — دل آساں است با دل درد باید
اس گرمجوشی میں کہ آہِ سرد کی ضرورت ہے — دل آسان ہے لیکن دل میں درد مشکل ہے

ہنوزم ہندواں آتش پرستند — ہنوزم چشم چوں ترکان مستند
ابھی تک ہندو، مجھ کو پوجتے ہیں — ابھی میری آنکھیں ترک ہیں

ہنوزم لب پر آب زندگانی است — ہنوزم آب در جوی جوانی است
ابھی تک میرے ہونٹوں میں آبِ حیات ہے — ابھی تک میرے چشمہ میں آبِ شباب ہے

بہ غمزہ گرچہ ترکی دستانم — بہ بوسہ دل نوازی نیز دانم
اگرچہ غمزہ کے لحاظ سے میں ترک ہوں — لیکن بوسہ سے میں دلداری بھی کر سکتی ہوں

برو تا بر تو نکشائم بخوں دست — کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست
ہٹ جا! ایسا نہ ہو کہ میں تیرے اوپر ہاتھ ڈالوں — ایسے اور بہت سے خون میری گردن پر ہیں

خسرو نے جب شاپور کے ہاتھ شیریں کو بلا بھیجا ہے، تو وہ کہتی ہے،

اگر خسرو نہ کیخسرو بود شاہ — نباید کردنش سر پنجہ با ماہ
بگو یم غمزہ را تا وقتِ شبگیر — سمندش را بہ رقص آرد بیک تیر
فرستم زلف را تا یک فن آرد — شکیبش را رسن در گردن آرد
میں زلف کو بھیجوں گی کہ چالاکی سے — خسرو کے صبر کو گرفتار کر کے لائے

مزاحی کردم واو خواست پنداشت　　دروغے گفتم واو راست پنداشت
میں نے تو دل لگی کی تھی تو وہ تقاضا سمجھے　　میں نے جھوٹ کہہ دیا تھا وہ سچ سمجھ گئے

خسرو ایک مرتبہ چند ندیموں کے ساتھ مستی کی حالت میں شیریں کے مکان پر گیا شیریں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کوٹھے سے اُترنا مناسب نہ سمجھا، خواصوں کو بھیجا کہ شہ نشین میں فرش کرکے وہیں خسرو کو بٹھائیں، خسرو کوٹھے پر جانا چاہتا ہے، شیریں منظور نہیں کرتی، اس موقع کا سماں اور سوال وجواب کا انداز دیکھو،

رقیبے را بہ نزد خویش خواند　　کہ مارا نازنیں بر در چرا ماند
ایک خواص کو اپنے پاس بولایا اور کہا　　کہ مجھ کو نازنین نے باہر کیوں بٹھایا
دروں شو، گو نہ شاہنشا غلامی　　فرستادست نزدیکت پیامی
اندر جاکر کہو کہ ایک شاہنشاہ نے نہیں بلکہ　　ایک غلام نے پیغام بھیجا ہے
کہ مہمانے بہ خدمت مے گراید　　چہ فرمائی؟ درآید یا نیاید
کہ ایک مہمان خدمت کیلئے آیا ہے　　کیا ارشاد ہے؟ اندر آئے یا نہ آئے
بدیں زاری پیام شاہ می گفت　　شکر لب می شنید و آہ می گفت
بادشاہ کا عاجزانہ کلام شیریں　　سُنتی تھی اور افسوس کرتی تھی
کنیزے کارداں را گفت آں ماہ　　بخدمت خیز و بیروں شو سوئے شاہ
ایک ہوشیار کنیز سے شیریں نے کہا کہ　　بادشاہ کے پاس جا،
فلاں شش طاق دیبا را بروں بر　　بزن با طاق ایں ایواں برابر
مخمل کے تھان لے جاکر　　شہ نشین میں بچھا دے
بنہ بر پیشگاہ و شقہ بر بند　　پس آنگہ شاہ را گو کاے خداوند
اور پردے باندھ کر　　بادشاہ سے کہہ
نہ ترک ایں سرا ہندوی ایں بام　　شہنشہ را چنیں دادست پیغام
اس گھر کی ترک (یعنی معشوق) نے نہیں بلکہ　　ہندو (غلام) نے حضور کو یہ پیغام دیا ہے،

اس کے بعد خسرو اور شیریں سے دو بدو گفتگو ہوئی ہے، خسرو کہتا ہے کہ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا، شیریں جواب دیتی ہے:

حدیث آں کہ در بستم روا بود　　کہ سرمست آمدن پیشم خطا بود

چوں من خلوت نشیں باشم تو مخمور — ز تہمت رائے مردم کے بود دور
تو می خواہی مگر کز راہِ دستاں — بہ نقلانم خوری چوں نقلِ مستاں
بدست آری مرا چوں غافلاں مست — چو گل بوی کنی واندازی از دست
رہا کن نام شیریں از لبِ خویش — کہ شیرینی دہانت را کند ریش
تو در عشق من از مالی و جاہے — چہ دیدی جز خداوندی و شاہے
تو ساغر می زدی با دوستاں شاد — قلم شاپور می زد تیشہ فرہاد

اس کے مقابلہ میں رندانہ شوخیاں دیکھو، شیریں جب کسی طرح راضی نہیں ہوتی تو خسرو اس سے کہتا ہے،

بہ گستاخی در آمد کای دلارام — گرفتہ چند خواہی بد، بیارام
خسرو نے گستاخانہ کہا کہ اے معشوق — یہ برہمی کب تک، ذرا نرم ہو،
چو می خوردی و می دادی بمن یار — چرا باید کہ من مستم تو ہشیار

تم نے شراب پی اور مجھ کو بھی پلائی، لیکن یہ خلاف انصاف ہے کہ میں مست ہو جاؤں اور تم ہوش میں رہو

شمار بوسہ خواہد بود کارم — تو می دہ بوسہ تا من می شمارم
میرا کام صرف بوسہ کا گننا ہوگا — تم بوسہ دیتی جاؤ میں گنتا جاؤں گا

یعنی یہ کام تمہارا ہی ہے، لیکن میں اس کو تمہاری خاطر سے انجام دے دونگا،

سکندر نے جب کنیزک چینی سے اختلاط کرنا چاہا ہے تو وہ غرور کے لہجہ میں اپنے اوصاف بیان کرتی ہے، بادشاہ اور کنیز کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن اس موقع پر نظامی نے جدّت آفرینی سے سکندر کا ایک ایک وصف بیان کرکے اس کے مقابلہ میں اس کے ترجیح کی وجہیں کنیز کی زبان سے ادا کی ہیں،

ملک گر ز جمشید بالاتر است — رخِ من ز خورشید زیباتر است
شہ ار کیقباد بلند افسر است — مرا افسر از مشک و از عنبر است
شہ ار چوں سلیمان شود دیو بند — مرا در جہاں ہست دیوانہ چند
شہ ار زانکہ عالم گرفت ای شگفت — من آں را گرفتم کہ عالم گرفت
اگر چہ کمند جہانگیر شاہ — فتادہ است در گردنِ مہر و ماہ
کمندے من از زلف بر سازمش — نہ ترسم بہ گردن در اندازمش

گر او را کمندے بود راہ گیر | مرا ہم کمندے بود شاہ گیر
گر او ناوک انداز از دور دست | مرا غمزۂ ناوک انداز ہست
سکندر بہ حیواں خطا می رود | من ایں جا سکندر کجا می رود
اگر راہِ ظلمات می بایدش | سرِ زلفِ من راہ بنمایدش
لبِ من کہ یاقوتِ رخشاں دو است | بسے چشمۂ آبِ حیواں درو است

**رزمیہ** شاہنامہ کو سو برس سے اوپر ہو چکے تھے، اس عرصہ میں زبان میں بڑا انقلاب ہو گیا تھا، سینکڑوں الفاظ بالکل متروک ہو گئے تھے، اکثر الفاظ حروف زائد گرا کر خوبصورت قالب میں ڈھل چکے تھے، عربی کے نئے نئے مانوس الفاظ داخل ہوتے جاتے تھے، زبان کے انقلاب کے ساتھ مضامین کی طرز ادا کی روش بھی بدل گئی تھی، استعارات اور تشبیہات میں لطافت و نزاکت آگئی تھی، طبیعتیں مضمون آفرینی کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں، ان باتوں سے شاہنامہ کی عالمگیر آواز دھیمی پڑنے لگی تھی، قصے زبانوں پر رہ گئے تھے، لیکن اشعار بھولتے جاتے تھے، اس بنا پر قوم کے شجاعانہ جذبات کے زندہ رکھنے کے لئے ایک دوسرے شاہنامہ کی ضرورت تھی جو سکندرنامہ کے قالب میں نمودار ہوا،

سکندرنامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوئی، لیکن مجبوری تھی، قومی تاریخ فردوسی کے حصہ میں آچکی تھی، رسول اللہ صلعم کے غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں شاعری کی گنجائش کم تھی کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا، خود کہتے ہیں،

چو نظمِ گذارش بود راہ گیر | غلط کردنِ رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتار نیست | ہمہ کارِ من خود غلط کار نیست
دگر بے شگفتہ گزاری سخن | ندارد نوی، نامہ ہائے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے، اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیا اور یورپ دونوں اس کو مانتے تھے، البتہ یہ افسوس ہے، کہ نظامی نے مذہب ملا دیا، یعنی ذو القرنین کو سکندر بنا دیا، جو صریح قرآن مجید کے خلاف ہے،

سکندرنامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں، بایں ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہو سکا، اس کے خاص اسباب ہیں،

۱۔ سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے، جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس طرح صاف صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ دل میں اتر جائے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے، اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا۔

۲۔ کتاب کا ہیرو ایک شخص یعنی سکندر تھا، اس لئے ایرانیوں کو اس کے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہو سکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہو سکتی تھی، شاہنامہ کے مقبول ہونے کا بڑا گُر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی،

۳۔ تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا اکتا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگون حالات ہیں، ایک غذا سے جی گھبرائے تو اَور طرح طرح کے الوانِ نعمت موجود ہیں،

۴۔ تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے، بخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم و سہراب، منیژہ و بیژن، جمشید و ضحاک کی داستانیں نہایت پُر اثر اور حسرت آمیز ہیں،

باوجود ان باتوں کے سکندر نامہ نے جو قبولیت حاصل کی، تعجب انگیز ہے، شاہنامہ کے سَو ڈیڑھ سو ہی برس بعد سکندر نامہ لکھا گیا، اور شہرتِ عام پا گیا، سکندر نامہ کو آج چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا، اس مدت میں اس طرز پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، سکندر نامۂ جامی، آئینۂ سکندری، ہمائی ہمایوں، اکبر نامہ، سلیمان نامہ[1]، ان کا نام کس نے سنا ہے؟

رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ پہلے حربی باجوں کے بجنے، دار و گیر، ہنگامۂ شور و غل اور عام ہلچل کا نقشہ کھینچا جائے، پھر فوجوں کی حملہ آوری، زور و شور، جوش و خروش کا ذکر کیا جائے پھر آلاتِ جنگ یعنی تیر و کمان، تیغ و سناں، نیزہ و خنجر کی کارستانیاں دکھائی جائیں، پھر ایک ایک پہلوان کا معرکہ میں آنا، رجز پڑھنا، مبارز طلب ہونا، حریف سے لڑنا، داؤں پیچ کرنا، مرنا یا مارنا، ان باتوں کا ذکر کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ میدانِ جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، سکندر نامہ میں یہ سب باتیں ہیں اور کمال کے درجہ پر ہیں،

حربی باجوں کا ذکر،

در آمد بہ غریدن آوازِ کوس ۔۔۔ فلک بر دہانِ دہل داد بوس

---

[1] یہ سب مثنویاں سکندر نامہ کی طرز پر اور اس کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔

ز غریدن کوسِ عالی دماغ — زمین لرزه افتاد در کوه و راغ
چناں آمد از نائے ترکی خروش — که از نائے ترکاں برآورد جوش
برآورده خرمهره آوازِ شیر — دماغ از دمِ گاودم گشت سیر
طریقے که از مقرعه خواسته — بروں رفت، زیں طاق آراسته
ز بیمِ چقاچق که آمد ز تیر — کفن گشت در زیرِ جوشن حریر
روا رو برآمد ز رہا نبرد — ہراہر درآمد به مردانِ مرد

**هنگامهٔ جنگ**

به جنبش درآمد دو دریائے خوں — شد از موجِ آتش، زمیں لاله‌گوں
زمیں گفتی از یک دگر بردرید — سرافیل صورِ قیامت دمید
یکے گفت ہوی و دگر گفت ہاں — برآورد سرہای و ہوی از جہاں
جگر تاب شد نعرہ ہائے بلند — گلوگیر شد حلقہائے کمند
سپاه از دو جانب صف آراسته — زمیں آسماں وار برخاسته
ز سمِ ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشته هشت
فرو رفت و بر رفت روزِ نبرد — نمِ خوں به ماہے و بر ماه گرد
ز بس گرد بر تارکِ ترک و زیں — زمیں آسماں، آسماں شد زمیں
چناں گرم گشت آتشِ کارزار — که از نعلِ اسپاں برآمد شرار
ز بس خوں که گرد آمد اندر مغاک — چو گوگردِ سرخ آتشیں گشت خاک
ز غریدنِ تندہ پیلانِ مست — گرہ در گلوی هژبراں شکست
زمیں کو بساطے بُد آراسته — غباری شد از جائے برخاسته
ز پولاد و پیکانِ پیکر شکن — تنِ کوه لرزید بر خویشتن
پدر با پسر کیں برآراسته — محابا شده، مہر برخاسته
ستونِ علم جامه در خوں زده — نجات از جہاں خیمه بیروں زده

**آلاتِ جنگ**

ز شمشیرِ برگشته جائے نبود — که در غار اژدرہائے نبود
نہنگِ خدنگ از کمینِ کماں — نیاسود بر یک زمیں یک زماں
کمند اژدہائے مسلسل شکنج — دہن باز کرده به تاراجِ گنج
ز بس بر دہن تا نخچ انداختن — نفس را نه راهِ بروں تاختن

ز نیزه نیستاں شده روئے خاک — ز گوپالہا کوه گشته مغاک
سناں در سناں رسته چوں نوکِ خار — سپر بر سپر بسته چوں لاله زار
نہنگان شمشیر جوشن گداز — به گردن کشی کرده گردن فراز
به ابرو درآمد کماں را شکنج — شتاباں شده تیر چوں مارِ گنج
ز روسی درآمد به ناورد گاه — یکے شیرِ پرطاس روئیں کلاه
مبارز طلب کرد و جولاں نمود — به نام آوری خویشتن را سرود
که پرطاسیاں را دریں خام چرم — به پرطاسئ من شو دشت گرم
پلنگاں درم بر سرِ کوہسار — نہنگاں خورم بر لبِ جوئبار
درشتم به چنگال و سختم بزور — به حمله درم پہلوئے نره گور
سنانم ز پہلو درآید به ناف — دروغے نمی گویم اینک مصاف
همه خونِ خام است نوشیدنم — همه چرم خام ست پوشیدنم
شه گردناں شاه گردوں گرائے — زبرکار موکب تہی کرد جائے
زده بر میاں گوہر آگیں کمر — درآورد پولاد ہندی به سر
به تن بر یکے آسماں گوں زره — چو مرغولِ زنگی گره در گره
یمانی یکے تیغ زہر آب جوش — حمائل فروہشته از طرفِ دوش
به کبکِ دری چوں درآید عقاب — چگونه جہد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیل تن — به تندی درآمد بر آں اہرمن
بزد بانگ بروی که اے زاغِ پیر — عقابِ جواں آمد آرام گیر
نخستیں نبردے که تدبیر کرد — بر آں تیره دل بارشِ تیر کرد
چو دژخیم را نامد از تیر باک — زننده شد از تیرِ خود خشمناک
یکے خشت پولاد الماس رنگ — برآورد و زد بر دلاور نہنگ
ز سختی که تن را بہم در فشرد — بر آں خایده شد خشتِ پولاد خرد
دگر خشتے انداخت زاں تیز تر — بر آں کشتنی هم نه شد کارگر
چو دانست کاں دیوِ آہن سرشت — نیندیشد از حربۂ تیر و خشت

اسلحۂ جنگ آراستہ ہوکر

جنگ

---

ے پرطاس ایک مقام کا نام ہے،

نہنگ جہانسوز را برکشید | سوئے اژدہائے دمندہ دوید
زدش بر کتف گاہ و بردش زجائے | چناں کاں ستمگر در آمد زجائے

لیکن انصاف یہ ہے، نظامی، فردوسی کی طرح خاص لڑائی کے داؤں پیچ اور فنونِ جنگ کی تصویر اچھی طرح نہیں کھینچ سکتے،

**نظامی اور فردوسی کا موازنہ** اگرچہ انصاف یہ ہے کہ نظامی فردوسی کے ہمپایہ نہیں ہیں تھوڑا سا شیریں پانی لے کر بار بار چھانا جائے، مقطر کیا جائے، اور پھر کسی خوشرنگ خوشنما گلاس میں رکھا جائے تو اس کی شیرینی، خوشگواری، صفائی اور خوشنمائی میں کیا شک ہے، لیکن ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر بہتا چلا جاتا ہے اس سے کیا نسبت، تاہم دونوں کلام دکھانے کے لئے ہم چند مشترک عنوانوں کے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کا فرق دکھاتے ہیں؛

سکندر کا قاصد بن کر نوشابہ کے دربار میں جانا، سکندر نامہ کی مشہور داستان ہے یہی قصہ شاہنامہ میں بھی ہے، فرق یہ ہے کہ شاہنامہ میں نوشابہ کے بجائے قیدافہ کا نام ہے جو اندلس کا بادشاہ تھا، باقی حالات مشترک ہیں، یعنی بادشاہ نے سکندر کو پہچان لیا ہے، اور اس سے اس کا اظہار کیا ہے، سکندر انکار کرتا ہے، بادشاہ اس کی تصویر منگا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ اپنے چہرہ سے ملاؤ، سکندر سخت مضطر ہوتا ہے، بادشاہ اس کو تسلی دیتا ہے کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے،

| فردوسی | نظامی |
|---|---|
| چو قیدافہ را دید بر تخت علج | بیاراست نوشابہ درگاہ را |
| زیاقوت و پیروزہ بر سرش تاج | بزر در گرفت آہنی راہ را |
| ززربفت پوشید چینی قبائے | پری چہرگاں رابصد گونہ زیب |
| فراواں پرستندہ پیشش بپائے | صف اندر صف آراست آں دلفریب |
| رُخ شاہ تاباں بہ کردار ہور | برآمود گوہر بہ مشکیں کمند |
| نشستنگہش راستون ہا بلور | خرد ہشت برگوہر آگیں پرند |
| پرستندہ با طوق و با گوشوار | برا ورنگ شاہنشہی بر نشست |
| بپا اندراں گلشن زرنگار | گرفتہ معنبر ترنجے بدست |
| سکندر بداں در شگفتی بماند | بفرمود کائیں بجائے آورند |

## فردوسی

فراواں نہاں نام یزداں بخواند
نشستنگہے دید، قیصر کہ نیز
نیامد درا زروم و ایراں بہ چیز
برمہتر اندر زمیں داد بوس
چناں چوں بود، مردم چاپلوس
درا دید قیدافہ بشناختش
بہ پرسید بسیار و بنواختش
بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ
فزوں کرد سوی سکندر نگاہ
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر
نبشتہ برو صورتِ دلپذیر
بہ پیشِ من آور چناں ہم کہ ہست
بہ تندی برو ہیچ پساموی[1] دست
بیاورد گنجور و بنہاد پیش
چو دیدش نگہ کرد ز اندازہ بیش
بہ چہر سکندر نکو بنگرید
ازاں صورت او را جدائی ندید
بدانست قیدافہ کاو قیصر است
براں لشکرِ نامور مہتر است
بدو گفت کاے مرد گسترده کام
بیا تا چہ دادت سکندر پیام
چنیں داد پاسخ کہ شاہ جہاں
سخن گفت با من میان مہاں

## نظامی

فرستادہ را در سرائے آورند
فرستادہ از در آمد دلیر
سوئے تخت شد چوں شتابندہ شیر
کمر بند شمشیر بکشاد باز
برسمِ رسولاں نہ بردش نماز
نہانی دراں قصر زیبندہ دید
بہشتی سرائے فریبندہ دید
زبس گوہریں گوش گردن کشاں
شدہ چشم بینندہ گوہر فشاں
ز تابندہ یاقوت و رخشندہ لعل
خرامندہ را آتشیں گشت نعل
مگر کان و دریا بہم تاختند
ہمہ گوہر ایں جا برانداختند
زنِ زیرک از سیرتِ شانِ او
دراں داوری شد ہراسانِ او
کہ ایں کارواں مرد آہستہ رائے
چرا شرطِ خدمت نیارد بجائے
ز سر تا قدم دید در شہریار
زرِ پختہ را بر محک زد عیار
چو نیکو نگہ کرد بشناختش
بہ تختِ خود آرام گہ ساختش
سکندر و بہ رسمِ فرستادگاں
نگہ داشت آئینِ آزادگاں

---

[1] یعنی بے احتیاطی سے ہاتھ نہ لگانا۔

## فردوسی

که قیدافهٔ پاک دل را بگوے
که جز راستی در زمانه مجوے
مگر سر نه پیچی ز فرمانِ من
نگهدار بیداد پیمان من
دگر هیچ تاب اندر آری بدل
بیارم یکے لشکرے دل گسل
بر آرم دمار از همه لشکرت
به آتش بسوزم همه کشورت
بدو گفت کاے زاده فیلقوس
همت رزم بزم ست هم نعم و بوس
دلیر آمدی پیش من باژ خواه
ندانم ترا این که بنمود راه
سکندر ز گفتار او گشت زرد
روان پر ز درد و رخان لاجورد
بدو گفت کاے مهتر پر خرد
چنیں گفته از تو نه اندر خورد
منم ینطقون که خدائے جہاں
جز این بچهٔ فیلقوسم مخواں
بدو گفت قیدافه کز داوری
لبت را بپرداز کا سکندری
بیاورد و بنهاد پیشش حریر
نوشته برو صورتے دلپذیر
که گر هیچ جنبش بدے در نگار
نبودے جز اسکندر شهریار

## نظامی

پس آنگه گذارش گرفت از پیام
که شاهِ جهاں داور نیک نام
چنیں گفت کاے داور نامجوی
ز نام آوران جهاں برده گوی
چه افتاد کز ما عناں تافتی
سوے ما تو یک روز نشتافتی
زبونے چه دیدی که توسن شدی
چه بیداد کردم که دشمن شدی
چو من را درین مملکت ساختم
بر او سایهٔ دولت انداختم
کمر چوں نه بستی بدرگاهِ من
چرا روی پیچیدے از راهِ من
به پاسخ نمودن زن هوشمند
ز یاقوت سربسته بگشاد بند
که صد آفریں بر تو شاهِ دلیر
که پیغام خود خود گزاری چو شیر
چناں آیدم در دل اے پهلواں
که با این سر و سایهٔ خسرواں
میانجی نهٔ شاه آزادهٔ،
فرستندهٔ نه فرستادهٔ،
پیام تو چوں تیغ گردن زند
کرا زهره کیں تیغ بر من زند
ز تیغ سکندر چه رانی سخن
سکندر توئی چارهٔ خویش کن

## نظامی

مرا خواندی و خود بدام آمدی
نظر پختہ تر کن کہ خام آمدی

جہاندار گفت اے سزاوار تخت
پژوہش مکن جز بہ فرمان بخت

سکندر محیط است و من چشمۂ آب
منہ تہمت سایہ بر آفتاب

بدرگاہِ او پیش ازاں بست عرض
کہ او را قدم رنجہ بایست کرد

دگر بار نوشابۂ ہوشمند
ز نوشین لبِ خویش بکشاد بند

کزیں بیش بر دلفریبی مباش
بہ ناراستی یک رکیبی مباش

پیامت بزرگ است و نامت بزرگ
نہفتہ مکن شیر در چرم گرگ

فرستادہ را نیست ایں دسترس
کہ با مایہ تندی برآرد نفس

بہ جباری خویش را کم کنند
نہ در پیش من پشت را خم کنند

جوابش چنیں داد شاہ دلیر
کہ ناید ز روباہ پیغام شیر

اگر من چہ چشم تو نام آورم
سکندر نیم زو پیام آورم

اگر در میانجی دلیر آمدم
نہ از روبہ از نزد شیر آمدم

برآشفت نوشابہ زاں شیر دل
کہ پوشیدہ خورشید را زیر گل

بفرمود کارد کنیزے دواں
حریرے بر و پیکر خسرواں

یکے گوشہ از شقۂ آں حریر
بدو داد کیں نقش بردست گیر

بہ بیں تا نشانِ رخ کیست ایں
دریں کارگاہ از پے چیست ایں

اگر پیکر تست چندیں مکوش
بہ ابروی خود آسماں را مپوش

سکندر بفرمان او ساز کرد
حریر نوشتہ ز ہم باز کرد

بعینہ درو صورت خویش دید
ولایت بدست بد اندیش دید

بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ
بدارائے خود برد خود را پناہ

(۱) سب سے پہلے اس پر نظر ڈالو کہ جہاں ایک ہی خیال ایک ہی واقعہ، ایک ہی بات کو دونوں نے لکھا ہے وہاں بھی، بندشِ الفاظ کے لحاظ سے کس قدر فرق ہے، نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی، فقروں کے دروبست، الفاظ کے شکوہ کا یہ انداز ہے کہ گویا شیر گونج رہا ہے، اس کے مقابلہ میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح

کوئی پرانا بڈھا پیرانہ لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا ہے، ان اشعار کا مقابلہ کرو،

| فردوسی | نظامی |
| --- | --- |
| زربفت پوشید چینی قبائے | بہ پیچیدگاں را بصد گونہ زیب |
| فراواں پرستندہ پیشش بپائے | صف اندر صف آراست آں دلفریب |
| برہنہ اندر زمیں داد بوس | سکندر بہ رسمِ فرستادگاں |
| چناں چوں بود مردم چاپلوس | نگہ داشت آئینِ آزادگاں |
| سکندر بداں در شگفتے بماند | نہانے دراں قصر زیبندہ دید |
| فراواں نہاں نام یزداں بخواند | بہشتی سرائے فریبندہ دید |
| بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ | ز سر تا قدم دید در شہریار |
| فزوں کرد سوئے سکندر نگاہ | زر پختہ را بر محک زد عیار |
| بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر | یکے گوشہ از شقۂ آں حریر |
| بنشتہ برو صورتے دلپذیر | بدو داد کیں نقش بر دستگیر |
| کہ قیدافۂ پاک دل را بگوئے | چنیں گفت کاے داورِ نامجوی |
| کہ جز راستی در زمانہ مجوے | ز نام آورانِ جہاں بردہ گوے |
| دلیر آمدی پیشِ من باز خواہ | کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر |
| ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ | کہ پیغامِ خود خود گزاری چو شیر |
| بدو گفت قیدافہ کز داوری | میانجی نۂ شاہ آزادۂ |
| ببت را بپرداز کا سکندری | فرستندۂ نہ فرستادۂ |
| سکندر ز گفتارِ او گشت زرد | بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ |
| رواں پُر ز درد و رخاں لاجورد | بدارائے خود برد، خود را پناہ |
| منم بیطقون کد خدائے جہاں | سکندر محیط است من جوی آب |
| جز ایں بچۂ فیلقوسم مخواں | منہ تہمتِ سایہ بر آفتاب |

(٢) انہی اشعار میں بلاغت کا فرق دیکھو،

| فردوسی | نظامی |
| --- | --- |
| فراواں پرستندہ پیشش بپائے | صف اندر صف آراست آں دلفریب |

فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم تھا، اور سب کھڑے تھے، لیکن نظامی کے بیان سے ان کا باقاعدہ صف بصف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، "آراست" کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنما کر دیا ہے،

| نظامی | فردوسی |
|---|---|
| سکندر بہ رسم فرستادگاں | بر مہتر اندر زمیں داد بوس |
| نگہ داشت آئین آزادگاں | چناں چوں بود مردم چاپلوس |

فردوسی نے سکندر کی شان کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، زمین چومنا خوشامدیوں کا شیوہ ہے، فردوسی کو اس پر بھی قناعت نہیں بلکہ کھول کر کہتا ہے کہ سکندر نے اِس طرح زمین چُومی جس طرح خُوشامدی چُوما کرتے ہیں، نظامی نے اگرچہ "بر رسم فرستادگاں" کے لفظ سے ظاہر کر دیا ہے، کہ سکندر نے قاصدوں کے طریق اور آئین کو ملحوظ رکھا تھا، تاہم دوسرے مصرع میں دفع دخل بھی کر دیا، کہ اس حالت میں بھی اپنی آن بان نہیں چھوڑی،

| نظامی | فردوسی |
|---|---|
| نہانے دراں قصر زیبندہ دید | سکندر بداں در شگفتے بماند |
| بہشتی سرائے فریبندہ دید | فراواں نہاں نام یزداں بخواند |

فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا، دربار کے ٹھاٹھ کو دیکھکر مبہوت ہو گیا تھا، اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا، نظامی نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خُوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا ہے، لیکن اسی قدر کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا،

| نظامی | فردوسی |
|---|---|
| ز سر تا قدم دید در شہریار | فزوں کرد سوئے سکندر نگاہ |

فزوں نگاہ کردن سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ قیدافہ سکندر کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا، ممکن ہے کہ صرف چہرہ پر ہی دیر تک اس کی نظر جمی رہی ہو، لیکن صرف چہرہ کی مشابہت پہچاننے کے لئے کافی نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں، لیکن اور اعضا میں فرق ہوتا ہے، بخلاف اس کے نظامی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ نوشابہ نے سکندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، یعنی نہ صرف چہرہ بلکہ تمام اعضا اور ڈیل ڈول، رنگ روپ، سج دھج کو بھی دیکھا جس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ سکندر ہے،

| نظامی | فردوسی |
| --- | --- |
| چنیں گفت کاے داور نامجوی | کہ قیدافۂ پاک دل رابگوے |
| ز نام آورانِ جہاں پردہ گوی | کہ جز راستی در زمانہ مجوے |

قاصد کا بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کا نام لینا، اور پھر فوراً تنبیہ اور نصیحت شروع کردینا دستور کے خلاف ہے، اس لئے نظامی نے نام نہیں لیا بلکہ داور نامجو کے لفظ سے خطاب کیا اور اس کے ساتھ مدحیہ الفاظ اضافہ کئے،

| نظامی | فردوسی |
| --- | --- |
| کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر | دلیر آمدی پیش من باز خواہ |
| کہ پیغامِ خود خود گزاری چو شیر | ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ |

فردوسی نے اس بات کو کہ قیدآفہ نے سکندر کو پہچان لیا نہایت بے مزہ طریقہ سے بیان کردیا ہے، اس کے ساتھ یہ الفاظ کہ معلوم نہیں کس نے تم کو یہ طریقہ سکھایا اور بھی بدتہذیبی ہے، بخلاف اس کے نظامی اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں، جس سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نوشابہ کو یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا بلکہ وہ سکندر کی دلیری اور جرأت کے اثر سے متاثر ہے، اور بے اختیار تعریف کرتی ہے،

| نظامی | فردوسی |
| --- | --- |
| بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ | سکندر ز گفتارِ او گشت زرد |
| بہ دارائے خود برد خود را پناہ | رواں پُر ز درد و رخاں لاجورد |

اس قدر مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ جب سکندر کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اس کو پہچان لیا، تو وہ ڈرا اور متردد ہوا، لیکن فردوسی نے اس کے ڈرنے کو اس قدر حد سے بڑھا دیا جو سکندر کی شان سے بالکل بعید ہے، "رواں پر ز درد و رخاں لاجورد" نظامی کے بیان سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا رنگ زرد پڑ گیا اور دل میں خدا سے دُعا مانگی کہ اس خطرہ سے بچ جائے، لیکن اتنا بھی بدحواس نہیں ہوا کہ دل میں ٹیس اٹھنے لگی فردوسی نے پہلے مصرع میں سکندر کا زرد پڑ جانا بیان کردیا تھا، لیکن اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی، اور دوسرے مصرع میں پھر کہنا "رخاں لاجورد"

(۳) اب عام طرح پر نظر ڈالو، جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے

کہ بیان کرنے والا واقعہ کا خاکہ (پلین) کیونکر قائم کرتا ہے، اور یہ بلاغت کا پہلا لیکن سب سے ضروری مرحلہ ہے،

فردوسی نے واقعہ کا جو خاکہ قائم کیا ہے اُس میں متعدد ناموزونیاں ہیں،

(۱) سکندر قاصد کے لباس میں خوشامدیوں کی طرح دربار میں آداب بجالاتا ہے،

(۲) دربار کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے، گویا کبھی شاہانہ دربار دیکھا ہی نہ تھا،

(۳) حالانکہ سکندر کی رفتار، گفتار، طور وطریقہ سے ابھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے اس احتمال کی طرف ذہن جائے کہ یہ خود سکندر ہے، تاہم بادشاہ کو شبہ ہوتا ہے اور وہ سکندر کے چہرہ کو بہت غور سے دیکھتا ہے، اسلئے نظامی نے اس کا یہ پہلو نکالا کہ سکندر نے قاصدوں کی طرح سجدہ نہیں کیا تھا، اِس حالت میں شُبہ پیدا ہونا ضرور تھا، اور شُبہ کو اسلئے قوت ہوئی کہ سکندر کی تصویر اُس کی نظر سے گزر چکی تھی،

(۴) قیدافہ نے سکندر کے سامنے ہی تصویر منگا کر دیکھی، حالانکہ مخفی طور سے سکندر کو پہچاننا مقصود تھا، تو سکندر کے سامنے تصویر منگوا کر دیکھنا نہ چاہیئے تھا،

(۵) سکندر جب قاصد کی حیثیت سے پیغام ادا کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، کہ آداب شاہی سے ناواقف ہے، اوّل تو بادشاہ کا نام لینا خلافِ ادب ہے، اسکے علاوہ پہلے ہی سخت کلامی شروع کردینی نہایت بدتہذیبی ہے،

برآرم دمار از ہمہ لشکرت　　　بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت

(۶) سکندر جب اپنے آپ کو چھپاتا، اور سکندر کا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہے تو اس کو سکندر کا نام بڑی تعظیم وتکریم سے لینا چاہیئے تھا، لیکن وہ سکندر کا بچۂ فیلقوس کے خطاب سے یاد کرتا ہے،

ع جز ایں بچۂ فیلقوسم مخواں

اس کے مقابلہ میں نظامی نے جس طرح اس تمام واقعہ کا خاکہ کھینچا ہے وہ یہ ہے،[۱]

نوشابہ کو جب معلوم ہُوا کہ سکندر کے دربار سے قاصد آتا ہے تو اُس نے بڑے سازو سامان سے دربار آراستہ کیا، خود بھی بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک ترنج لئے ہوئے تختِ شاہی پر بیٹھی، سامنے پری چہرہ کنیزیں صف باندھ کر کھڑی ہوئیں، پھر سکندر کو طلب کیا، سکندر دربار میں آیا تو آداب شاہی کے موافق کمر بند سے تلوار کھول کر رکھ دی، لیکن سجدہ نہیں کیا، اس موقع پر دربار جو جواہرات سے جگ مگ کر رہا تھا، اس کو نہایت مبالغہ آمیز پیرایہ میں ادا کیا ہے،

---

[۱] اس بیان میں فردوسی اور نظامی کے اشعار مکرر آگئے ہیں، لیکن اس بحث کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کیلئے ایسا کرنا ضرور تھا،

زتابندہ یاقوت درخشندہ لعل ‏ ‏ ‏ خرامندہ را آتشیں گشت نعل
مگر کان و دریا بہم تاختند ‏ ‏ ‏ ہمہ گوہر آں جا بر انداختند

قاصد کے شاہانہ طرز کلام سے نوشابہ کو شبہ ہوا کہ یہ خود سکندر ہے، خوب غور سے دیکھا تو یقین ہو گیا، قاصد نے اب پیغام ادا کرنا شروع کیا، کہ شہنشاہ نے کہا ہے کہ ہماری طرف سے کیا کمی ہوئی جو تم نے بے اعتنائی کی، آج تک تم دربار میں نہ آئے، ہم ان اطراف میں بھی آئے، لیکن تم نے اِدھر رُخ نہ کیا،

نوشابہ نے کہا کہ آپ کی جرأت پر صد ہزار آفرین ہے کہ آپ اپنا پیغام ادا کرتے ہیں، آپ کی باتیں تلوار کا کاٹ کرتی ہیں، یہ تلوار اور کس کی مجال ہے کہ مجھ پر چلائے، سکندر انکار کرتا ہے، کہ مَیں سکندر نہیں، پھر اس کی نہایت عمدہ توجیہیں بیان کرتا ہے، کہ کجا سکندر، کجا مَیں، سکندر کے دربار میں آدمیوں کی کیا کمی ہے کہ خود قاصد بن کر آتا، اس موقع پر نوشابہ و سکندر کے سوال و جواب کو نہایت بلیغ انداز میں طول دیا ہے، آخر نوشابہ جھلا کر سکندر کی تصویر منگوا کر اس کو دکھلاتی ہے، اور سکندر لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، اس کے ساتھ خطرہ کے خیال سے اس کے چہرہ کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے،

اس تمام سلسلہ میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تمام واقعات، اصلیت اور نیچر کے مطابق ہیں، اس کے ساتھ فصاحت و بلاغت، تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شکوہ، ان تمام باتوں نے اِس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہے،

نظامی اور فردوسی میں یہ فراق اور بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہے، لیکن طُول کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، سکندر و دارا کی گفتگو اوپر گزر چکی ہے، اس کو اس موقع پر ایک بار اور دیکھ لینا چاہئے، ان سب باتوں پر بھی فردوسی، فردوسی ہے اور نظامی، نظامی ؛؛

# چند ضروری باتیں

۱۔ شعر العجم کے چار حصّوں میں سے یہ پہلا حصّہ جو شائع ہو رہا ہے، اس میں صرف قدیم شعراء کے حالات اور ان کی شاعری سے بحث ہے، دُوسرا اور تیسرا حصّہ مطبع میں جا چکا ہے، پہلے حصّہ کی تالیف میں اگرچہ تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھ کو صاف کہنا چاہیئے کہ یہ حصّہ اور تمام حصّوں کی بہ نسبت کم دلچسپ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف کی دلچسپی یا شعرا کے حالات سے ہو سکتی تھی یا اُن اشعار سے جو جا بجا مثال میں پیش کئے جاتے ہیں، قدیم شعرا کے حالات کم ملتے ہیں، اور یہ حصّہ قدماء ہی تک محدود ہے، دقیقی عنصری، نظامی بہت بڑے رتبہ کے شاعر ہیں، لیکن ان کے حالات اور واقعات اس قدر کم ہیں کہ مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پھیلانا پڑا ہے، قدماء میں سے دَور اوّل کی زبان آج بالکل نامانوس ہے، دقیقی، فردوسی، منوچہری، عنصری کے متواتر دو شعر بھی آج کل کی زبان میں نہیں ملتے، اس کے علاوہ ان کی شاعری میں عشق کی چاشنی گویا ہے ہی نہیں، اِس لئے ان کے کلام میں آج کل کے لوگوں کو مزا نہیں آسکتا،

غرض یہ حصّہ چنداں تفریح اور تفنّن کے کام کا نہیں، اس کو ایک علمی خُشک مضمون کی حیثیّت سے پڑھنا چاہیئے، باقی حصّے البتّہ دلچسپ، بامزہ اور رنگین ہیں،

۲۔ چونکہ کتابوں کے تفحّص اور تلاش کا سلسلہ اب تک قائم ہے، اور بعض بعض نادر کتابیں اس حصّہ کی تصنیف کے بعد ہاتھ آئیں، اس لئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے، اب چوتھے حصّے کے کام آئیں گے، مثلاً تمام تذکروں میں مذکور ہے، کہ ایران میں سب سے پہلے بہرام گور نے شعر کہا اور وہ یہ تھا،

منم آں پیل دمان ومنم آں شیر یلہ　　　نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

لیکن میں نے اس روائیت کو اس لئے نظر انداز کیا تھا، کہ اوّل تو اُس زمانہ کی زبان نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ بہرام کے کلام میں ابو جبلہ عربی لفظ کیوں آتا، لیکن لب اللباب عوفی کی پہلی جلد، کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہرام گور عرب میں پلا تھا، اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا، چنانچہ عوفی نے اس کا عربی دیوان

خود دیکھا تھا، لبّ اللباب میں یہ شعر کسی قدر تغیّر کے ساتھ مذکور ہے، جس سے اُسکی ساخت اور زبان دونوں پر اثر پڑتا ہے،

۳- دُنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے، اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہیئے، یہ مصیبت مدّت سے مجھ کو پیش آتی ہے، لیکن علاج کی کوئی صُورت نہیں نکلتی، کاپیوں اور پرُوف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، کسی کتاب کے ساتھ غلط نامہ لگانا بھی بیکار سا ہے، غلط نامہ سے کتاب کو مطابق کر کے تصحیح کرنا، اتنی بڑی زحمت کون اُٹھائے، اسی بنا پر میں نے کبھی اس کا قصد نہیں کیا، لیکن شعر العجم فارسی لٹریچر کا آئینہ ہے، اس کی غلط بیانی کا اثر خود زبان پر پڑ سکتا ہے، اس لیے چار و ناچار مَیں خود زحمت اُٹھاتا ہوں اور احباب کو بھی زحمت دیتا ہوں، خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے اس لیئے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں، ایک عام غلطی یہ ہے، کہ بین السطور میں جہاں کہیں میں نے کسی لفظ کو نیچے اس کے معنی لکھ دیئے ہیں کاتب صاحب وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے لفظ کے نیچے وہ معنی لکھ دیتے ہیں، اور اس سے مصنّف کی سخت جہالت ثابت ہوتی ہے،

ایک جگہ اہلِ مطبع نے نہیں بلکہ مَیں نے خود سخت غلطی کی ہے، جس سے فردوسی کی شاعری پر حرف آتا ہے، اس لئے نہایت ندامت کے ساتھ فردوسی سے اس کی معافی چاہتا ہوں، کتاب کے صفحہ سطر میں یہ عبارت ہے،

"صلاح و مشورہ کے لیئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اتنے میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھا پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند نشستند خوردند و برخاستند

لیکن فردوسی کا شعر مَیں نے غلط نقل کیا، اور اس لیے شعر کا دُوسرا مصرع اصل میں یُوں آیا ہے،

نشستند و گفتند و برخاستند

ہر نکتہ دانِ بلاغت جانتا ہے کہ اس ایک لفظ (گفتند) کے تغیر سے شعر برباد ہو جاتا ہے ؛

تمّت بالخیر

غلام مصطفےٰ قریشی صدیقی تحریر نمود
نامی پریس لاہور

LIBRARY Nankana Sahib
Acc. No. 142673
16-08-2022
Managed by Chughtai Public Library